عکسِ غالب

کلامِ یسیر میں رومانیت



ڈاکٹر محبہ وٹموری

عکسِ غالب

کلامِ یسیر میں رومانیت

ڈاکٹر محبّہ ونٹموری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲

AKS E GHALIB
KALAM E YASEER MEIN RUMANIYAT
by

Dr. Mohiba Vantmuri
Mob:9738593324/E-mail: mohibavantmuri@gmail.com

Year of Edition : 2023
ISBN:978-81-960450-5-0
Price ₹ 250/-

نام کتاب	:	عکسِ غالب: کلامِ یسیر میں رومانیت
مصنفہ	:	ڈاکٹر محبہ ونٹموری
		ایم۔اے،ایم۔فل،بی۔ایڈ،NET،پی۔ایچ۔ڈی
پیشہ	:	اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج فار ویمنس، چنتامنی، 563125، ضلع چکبلّہ پور۔ کرناٹک
تعداد	:	۵۰۰
صفحات	:	۱۲۰
سنہ اشاعت	:	۲۰۲۳ء
قیمت	:	۲۵۰ روپے
کمپیوزنگ	:	SAQI CREATIONS
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

ملنے کا پتہ:

#677,old No: 7 Veerabhadrappa Street,R.S. Palya,Kamman Halli Main Road,
Bangalore -33 ,KARNATAKA

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 41418204, 45678286, 45678203, 23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

یہ کتاب ان کے نام جن کا وجود میرے وجود میں
زندہ ہے۔جن کی شفقت بھری نگاہوں کی میں
نورِ نظر ہوں۔میری مراد میرے ابو جان جناب
ابراہیم وٹموری مرحومؒ ہیں۔

فہرست

●●●

''مقدمہ''

تحقیق کی دو قسمیں ہیں اولاً ''سندی'' جو کوئی سند (ڈگری) حاصل کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے ثانیاً غیر سندی، جس کا مقصد کوئی سند حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ حقیقتاً دونوں قسم کی تحقیق کا اصل مقصد حقائق کی تلاش ہوتا ہے تاہم سندی تحقیق کی اکثر و بیشتر غرض محض سند حاصل کرنا ہی ہوتا ہے اس لئے محقق اپنی رائے کھل کر بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے اور عموماً اختلافی بحثوں کے قریب بھی نہیں جاتا۔ لیکن غیر سندی تحقیق میں آزادی اور غیر جانبداری نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور محقق اپنی رائے پیش کرنے میں کسی بھی قسم کے دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ البتہ بعض تحقیقی مقالے مجموعی طور پر نہیں تو کافی حد تک غیر سندی نوعیت سے بہت قریب نظر آتے ہیں میری یہ پختہ رائے ہے کہ ڈاکٹر محبہ وٹموری کا تحقیقی مقالہ ''کلامِ یسیر میں رومانیت اور نرگسیت'' خاص کر کیفیت کے اعتبار سے اس کا ثبوت مہیا کرتا ہے انتہائی مسرت کی بات ہے کہ موصوفہ کو اس تحقیقی مقالہ پر سری وینکٹیورا یونیورسٹی تروپتی نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری سے نوازا اور یہ جان کر خوشی دوبالا ہوگئی کہ وہ اس مقالہ کو دو کتابوں کی شکل میں شائع کر رہی ہیں یہ مقالہ شہر کرنول کے استاد شاعر 'غالبِ دکن' امیر علی خان یسیر کی شخصیت اور شاعری پر ترقیم ہے، یسیر کرنولی کی عظمت اور اس مقالہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اردو کے مشہور و معروف شاعر اوج یعقوبی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

''شرافت و انکساری، سادگی و محبت کے اس پیکر کو دیکھ کر پہلے پہل یہ ماننے ہی کو تیار نہ ہوا کہ واقعی یہ صاحب شاعر ہوں گے لیکن جب اس مشاعرے میں غالب کی ایک سنگلاخ زمین میں یسیر صاحب نے غزل سنائی تو خود میری ہمہ گوئی اور ہمہ دانی کا احساس متزلزل ہو کہ رہ گیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کرنول جیسے دور افتادہ مقام میں ایسا شاعر بھی ہوگا۔ میں اگر زیادہ صاف گوئی سے کام لوں تو بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہوں کہ رفع شک کے طور پر میں نے ان سے کچھ سنانے کی خواہش کی چنانچہ یسر صاحب نے غالب ہی کی زمینوں میں مزید دو غزلیں سنائیں، نتیجتاً مجھے کہنا

پڑا کہ علامہ یسیر کو 'غالبِ دکن' کا خطاب دیا جانا چاہیے، غالباً یہ بات میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی جس میں بھرپور خلوص تھا کہ آج سارا آندھراپردیش آپ کو 'غالبِ دکن' ہی کے نام سے جانتا ہے۔''

ڈاکٹر محبہ وٹموری کا آبائی وطن ریاستِ کرناٹک کا ایک ضلع بلگام ہے، اپنے والد محترم کی ملازمت کے سلسلے میں انہیں شہرِ کرنول منتقل ہونا پڑا، انہوں نے بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں ایس۔کے۔یونیورسٹی، اننت پور سے حاصل کیں۔ بعدازتحقیقی طرف توجہ دیتے ہوئے اس وی یونیورسٹی، تروپتی سے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی اسناد حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ محبہ ایک قابل طالبہ رہی ہیں اور ابتداء ہی سے شعروادب کا ذوق ان کے دل میں پروان چڑھتا رہا ہے، جو انتہائی شستہ اور شائستہ ہے اردو شعروادب سے ان کی محبت اور مسلسل محنت نیز لگن وانہماک نے انہیں اس مقام تک پہنچایا ہے انہیں اپنی ذاتی زندگی میں غیر معمولی نشیب وفراز سے گزرنا پڑا تاہم انہوں نے جہدِ مسلسل اور مقصد سے لگاؤ کو اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں ہاتھ سے جانے نہیں دیا، وہ آگے بڑھتی رہیں اور آج بھی از حد کامیابی کے ساتھ بنگلور کے ایک گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ تحقیقی مقالے تو روز روز لکھے اور جامعات میں داخل کئے جاتے ہین جن پر طلبہ وطالبات کو یونیورسٹیاں اسناد سے بھی نوازتی ہیں لیکن ان میں صرف چند مقالے ہی معیاری اور اشاعت کے لائق ہوتے ہیں مقالہ کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کے لئے محقق کا پُر اعتماد ہونا ضروری ہے اور مجھے خوشی ہے کہ محبہ وٹموری میں حوصلہ، ہمت اور اعتماد اس قدر ہے کہ انہوں نے اپنے مقالہ کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

ڈاکٹر محبہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مقالہ نگاری سے کیا ہے انہوں نے کئی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں مختلف موضوعات پر اچھے مقالے پیش کر کے اہلِ نظر سے داد وتحسین حاصل کی ہے تاہم ''عکسِ غالب'' ان کی پہلی مبسوط تصنیف ہے اردو ادب کے ہر میدان اور خاص طور پر جنوبی ہند میں خواتین قلم کاروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے اس تناظر میں ڈاکٹر محبہ وٹموری کا اردو کی ادبی دنیا میں استقبال ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب کے چھ باب ہیں، ۱۔ ضلع کرنول کا ادبی وثقافتی پس منظر، ۲۔ رومانیت:

افکار واثرات ،۳۔ اردو ادب کے چند منتخب رومانی شعراء کا سرسری جائزہ ،۴۔ یسیر کرنولی کے حالاتِ زندگی ،۵۔ کلامِ یسیر میں رومانیت ،۶۔ کلامِ یسیر پر چند ناقدین کی آراء۔ ڈاکٹر محبہ نے پہلے باب میں یسیر کرنولی کے عہد کے ثقافتی اور ادبی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے قارئین کو شہر کرنول کے ادبی ماحول سے آگاہ کیا ہے انہوں نے یہ جانکاری دی ہے کہ یسیر کرنولی کی ذہن سازی میں کونسے عناصر کارفرما رہے ہیں، نیز اپنے ماحول سے انہوں نے کیا اثرات قبول کیئے اور یسیر کے کلام کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔ شہر کرنول کے ثقافتی اور ادبی پس منظر سے ایک اقتباس پیش ہے۔

''شہر کرنول صدیوں سے علم وادب اور تصوف کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے اکثر صوفیہ اکرام اردو کے بہترین شاعر ہیں ان ہی کے فیض سے یہاں کے علمی وادبی اداروں اور محفلوں کا قیام عمل میں آتا رہا ہے ان صوفیہ اکرام نے فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں شعر کہئے ہیں اور یہاں کی شعری محفلوں کی سر پرستی فرمائی ہے نوابانِ کرنول نے بھی صوفیہ اکرام سے روحانی، علمی وادبی فیض حاصل کیا ہے نوابانِ کرنول میں بھی ایسے افراد ملتے ہیں جو فارسی اور اردو میں شعر کہا کرتے تھے نواب الف خاں بہادر اور نواب اکبر خاں کے کلام کے نمونے آج بھی دستیاب ہیں۔ عام شعراء کی طرح یسر کرنولی کے مزاج میں نہ تکبر تھا نہ گفتگو میں انانیت کا اظہار ہوتا تھا وہ سادگی، شرافت و انکساری کی منہ بولتی تصویر تھے، سگریٹ، چائے اور ناس کے عادی تھے لیکن ان سب کے استعمال کے بھی اوقات مقرر تھے۔ بے وقت کسی چیز کو ہاتھ لگاتے تھے۔''

اس کتاب کا بابِ دوم ''رومانیت: افکار واثرات'' ہے۔ اس کا آغاز ڈاکٹر محبہ نے اس جملہ سے کیا ہے ''رومانیت ایک خالص علمی وادبی اصطلاح ہے۔ اس کے بعد رومانیت کے مفہوم سے متعلق غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اس کے محدود معنوں کو وسعت دی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ رومانیت دراصل عملاً کلاسیکیت کے خلاف ایک علم بغاوت بلند کرنے کا نام ہے۔ کلاسیکیت اور رومانیت کے اصولوں اور ان کی قدروں کی وضاحت سے انہوں نے ان دونوں کو سمجھنے میں قارئین کی رہنمائی کی ہے کتاب کا یہ اقتباس انتہائی اہمیت رکھتا ہے:

''رومانی تحریک، کلاسیکی تحریک کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی، اس لحاظ سے جب ہم ان دونوں تحریکوں سے متعلق رجحانات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو جو واضح فرق سامنے آتا ہے وہ

کچھ اس طرح کا ہے کہ کلاسیکی شعراء کے پاس عقل، ہئیت وفکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو رومانی شعراء کے یہاں وجدان اور جذبات کا اثر غالب نظر آتا ہے کلاسیکی شعراء خارجی وسائل کی مدد سے دنیا کی تعمیر کرنے کا عزم رکھتے ہیں اوراس قدر خارجی دنیا کی تشکیل میں گم نظر آتے ہیں کہ ان کے نزدیک داخلی دنیا کا تصور ہی مفقود ہو جاتا ہے جب کہ رومانی شعراء وجدان سے ایک ہی دنیا کی تعمیر کر لیتے ہیں جس میں ان کے سکونِ قلب کا سامان موجود ہوتا ہے۔''

اکثر طالبِ علم اور ریسرچ اسکالرس کلاسیکیت اور رومانیت کے مابین باریک فرق کو سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر رہتے ہیں لیکن اس باب کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر محبہ وٹموری کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے ان دونوں رجحانات کی افہام وتفہیم میں کمال دکھایا ہے۔ خاص کر رومانیت کی تشریح سو سو طریقوں سے کی ہے کہ یہ باب یسیر کرنولی کی رومانی شاعری ہی نہیں بلکہ اردو کے ہر رومانی شاعر کے کلام کو سمجھنے میں انتہائی مدد ومعاون ثابت ہوگا۔

''عکسِ غالب'' کا تیسرا باب اردو ادب کے چند منتخب رومانی شعراء کی حیثیت سے جنہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے ان میں حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، عزیز لکھنوی، فراق گورکھپوری، عرش ملیسانی، حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محبہ نے اس باب مین مذکورہ شاعروں کی رومانوی فکر کا ان کے اشعار کے حوالوں سے تجزیہ کیا ہے
حفیظ جالندھری سے متعلق لکھتی ہیں:

''ان کی غزلیں ان کی رومانی فکر کی بہترین مثال ہیں جن میں ایک درد بھری تڑپ اور سادہ بیانی کی شان ملتی ہے جو رومانی طرز کا خاصہ رہا ہے۔''

ان کا ایک شعر۔

حُسن نے عشق پہ حیرت کی نگاہیں ڈالیں
خود تماشا ہوئے ہم محوِ تماشا ہو کر

رومانی شاعر کی حیثیت سے اختر شیرانی غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں محترمہ کے خیال میں رومانی شاعر ہونے کے ناطے اختر نے اپنے خیال کی دنیا میں ایک جنت تعمیر کر لی تھی جہاں دوشیزگی کا نکھار جادو جگاتا ہے ان کے کلام میں سرشاری اور سپردگی کا احساس موجود ہے۔

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے

جوش کو علی سردار جعفری نے سو فیصد رومانی شاعر قرار دیا ہے، بقول مصنفہ جوش کی رومانیت جو وطن کی محبت اور آزادی کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے صحتمند اور انقلابی عناصر کی حامل ہے ۔

لہراتی تھیں زلفیں کھل کھل کر اس شان سے رنگیں شانوں پر
جس طرح گھٹائیں ساون کی جھک پڑتی ہیں مے خانوں پر

ڈاکٹر محبہ نے بجاطور پر کہا ہے کہ، عزیز لکھنوی، رومانوی اندازِ فکر سے زیادہ قریب تھے، ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے فراق کی شاعری، ندرتوں اور جذبوں کو جگانے والی شان رکھتی ہے، جذبات، وارداتِ قلب اور بے ساختگی کی روایت کو عام کرنے کے لحاظ سے حسرت موہانی اردو کی رومانوی شاعری میں بے باک شاعر سمجھے جاتے ہین جگر مرادآبادی کے پاس عشق کی وارفتگی اور رنگینیٔ بیان کی دلکشی پائی جاتی ہے وہ ظاہری حسن کے طرفدار ہیں ۔

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے ، میں زمانے پہ چھا گیا

عکسِ غالب کے چوتھے باب 'یسر کرنولی کے حالتِ زندگی' میں ڈاکٹر محبہ نے یسر کی پیدائش وطن ابتدائی و اعلیٰ تعلیم، ملازمت اور اس سے سبکدوش نیز شاعری سے ان کی دلچسپی کی تفصیلات سلیقہ اور ترتیب سے پیش کی ہیں علاوہ ازیں یسر کی شخصیت کے مختلف پہلو جیسے ان کے مزاج، ان کی علالت اور وفات سے متعلق بھی جانکاری دی ہے۔ یسر کی شخصیت کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

''یسر اپنی نجی زندگی میں انتہائی باکردار اور بااصول محتاط آدمی تھے عام شعراء کی طرح نہ ان کے مزاج میں تکبر تھا نہ گفتگو میں انانیت کا اظہار ہوتا تھا وہ سادگی، شرافت وانکساری کی منہ بولتی تصویر تھے سگریٹ، چائے اور ناس کے عادی تھے لیکن ان سب کے استعمال کے بھی اوقات مقرر تھے بے وقت کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔''

اس کتاب کا سب سے اہم باب اور تصنیف کی روح ''کلام یسر میں رومانیت'' ہے۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر محبہ نے اپنی سندی تحقیق کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا

وہ کوئی عام اور روایتی نہیں تھا یہ موضوع سندی ہوتے ہوئے بھی غیر سندی لگتا ہے دراصل رومانیت اور نرگسیت دونوں موضوعات اسکالر کی انتقادی صلاحیت عمدہ ہے، اس باب میں مصنفہ نے رومانیت سے متعلق خود یسیر کا نظریہ پیش کیا ہے جس کو انہوں نے یسیر کرنولی کے خطبۂ صدارت سے اخذ کیا جو یسیر نے 16 / مارچ 1975 کو منعقدہ شعبۂ اردو و عربی، اسلامیہ کالج، وانمباڑی (تمل ناڈو) کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا، ان کے الفاظ ہیں:

''روحِ عصر ایک عالم کرب و اضطراب سے گزر رہی ہے سکون و عافیت کی متلاشی انسانیت اس سرمدی کیفیت و لذت کو ترس رہی ہے جو اسے یقین کی پُر اسراریت اور رومانوی ماورائیت ہی فراہم کی جاسکتی ہے اس عالم گیر اضطراب کے سائے میں رومانوی ادب ابھر رہا ہے اور ایک نئی طرز کی رومانویت جنم لے رہی ہے رومانویت نام ہے جذبے اور وجدان کے ارتقاء کا۔ عرفانِ حیات و کائنات اور خالق کائنات تک پہنچنے کے لئے خود کو نہیں عشق ہی کو راہبر بنانا ہوگا جو ہمیں پایانِ منزل تک پہنچا سکے۔''

ڈاکٹر محبہ نے بڑی بے باکی سے یہ خیال ظاہر کیا ہے اور بجا طور پر کہ اس مقالہ سے قبل دیگر مقالہ نگاروں اور حتی کہ نقادوں نے یسیر کے کلام میں کلاسیکی شعراء کی طرح صرف حسن و عشق اور تغزل کے عناصر کی نشاندہی پر اپنی ساری اس ضمن میں انہوں نے ناقدین کے تسامح کی وجہ بھی بتائی ہے اور غالب دکن کا مرزا غالب سے رومانیت کے حوالہ سے موازنہ بھی کیا ہے جس کو ڈاکٹر محبہ کی ادبی بالغ نظری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے مصنفہ کے یہ معروضات مدلل ہیں کہ ''یسیر کی غزل، رومانی غزل ہے اور رومانیت کے سارے عناصر یسیر کے کلام میں ملتے ہیں'' یا پھر یہ کہ ''رومانوی شاعر، محبوب کے حسن کا متلاشی ہوتا ہے وہ اپنے محبوب کو پھول کی خوبصورتی میں بہار کی طرب افزاء فضا میں، دل کی گہرائیوں میں، تمنا کی آنکھ میں حتیٰ کہ خزاں کی افسردگی میں دیکھتا ہے۔'' اور یہ بھی کہ ''رومانیت کا بہت بڑا جزو حُسن کے اعلیٰ ترین مقام تک رسائی ہے''۔ محبہ نے اپنے بیانات کو یسیر کے شعری مجموعہ ''نفیرِ شوق'' کے اشعار سے تقویت پہنچائی ہے کتاب سے ایک اہم اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔

''رومانی شعراء کا عشق، عشقیہ شاعری کے عاشق کی مریضانہ ذہنیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس میں بوالہوسی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ رومانوی عاشق خلوص ایثار، سپردگی، بے نیازی اور

محبوب کی مرضی اور مزاج کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے اس عشق میں الفت ہی اس کی رہنما و رہبر ہوتی ہے جو عشق کی آگ میں جلتا ہے وہ بے شمار خوبیوں کا حامل ہو جاتا ہے اگر چاہے تو وہ قوتِ عشق سے ایک نئے عالم کو ایجاد کر سکتا ہے۔''

علاوہ ازیں رومانی شاعری کے غم کی نوعیت، ہر برائی، سختی، غلامی اور پابندیوں سے بغاوت اس کے یہاں ایثار و قربانی کی کیفیت اور اس کے شوق کی بنیادی حرکت وغیرہ ہم رجحانات کی توضیح و تشریح کلامِ یسیر سے پیش کرنے میں ڈاکٹر محبہ نے غیر معمولی انہماک و استغراق کا ثبوت دیا ہے جو لائقِ داد و تحسین ہے۔

ڈاکٹر محبہ نے اپنی کتاب ''عکسِ غالب'' کا اختتام 'ناقدینِ یسیر' پر کیا ہے، محترمہ کی اطلاع کے مطابق اردو کے بڑے ناقدین تک یسیر کے کلام کی رسائی نہیں ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے کلام کو کسی پرچے، اخبار یا رسالے مین اشاعت کے لئے نہیں بھیجا، اگر انہیں یہ شوق ہوتا ممکن ہے کم از کم اردو کے چند اہم ناقدین یسیر کی شعری پر ضرور نقد و تبصرہ کرتے اور ان کے کلام کی خصوصیات کو اجاگر کرتے۔ اس کے باوجود جنوب کے چند اہم نقادوں نے یسیر کے کلام کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے بالخصوص ان کی شاعری کے امتیازات کی کھل کر داد دی ہے چند نام ہیں، پروفیسر رضی الدین احمد، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر عبدالرزاق فاروقی، ڈاکٹر نجم الہدیٰ ڈاکٹر سید ابوالفضل محمود قادری، ملک الشعراء اوج یعقوبی، وحید پاشاہ قادری اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی وغیرہ۔ ڈاکٹر رضی الدین احمد کے الفاظ میں ''یسیر کے پاس غالب کی زمین اور ترکیبیں ہی نہیں بلکہ طرز و تیور بھی غالب کے سے ہیں۔'' پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے نزدیک اردو غزل کو اس کی تمام کلاسیکی نزاکتوں، نفاستوں، ندرتوں اور نکہتوں کے ساتھ عصرِ حاضر میں جن چند شاعروں نے وزن و وقار کے ساتھ برقرار رکھا ہے ان میں ایک اہم نام یسیر کرنولی کا ہے، ڈاکٹر فاروقی لکھتے ہیں:

''یسیر نے غزل کے قدیم رنگ پاسداری کے ساتھ ساتھ ۔۔۔مسائل کے اظہار کی ذمہ داری کو بھی خوب نبھایا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان کسی خاص نظریہ کے پروپگنڈے کی زبان نہیں ہے وہی زبان جس کا روایتوں سے رشتہ استوار ہے۔''

نجم الہدیٰ رقمطراز ہیں:

''یسیر صاحب کی شاعری صرف دفع الوقتی کا دماغی مشغلہ بن کر نہیں رہ گئی بلکہ وہ اس میں چیز دیگر بھی ہے جو شاعر کو حقیقی بناتی ہے یعنی جذبے کی وحدت اور فکر کا وہ عنصر جس کے بغیر آج تک کوئی شاعر کامیاب نہ ہو سکا۔''

ناقدین یسر کی فہرست میں ان کے وطن کے ایک اہم شاعر و نقاد ڈاکٹر صدیق قیسی قمر نگری کا کلامِ یسیر سے متعلق ان کی آراء انتہائی معتبر قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ دونوں کی تنقیدی صلاحیتیں شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔

بہر کیف ایک متنوع موضوع کے انتخاب اور اس سے مناسبت رکھنے والے عمدہ مواد کو پیش کرتے ہوئے اس موضوع سے بھرپور انصاف کرنے اور ان کی پہلی کتاب کی اشاعت پر میں ڈاکٹر محبہ وٹموری کو صمیم لب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ اپنے تصنیف و تالیف کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اردو ادب میں اپنی شناخت قائم کریں گی۔

''چلے چلو کہ ابھی منزل نہیں آئی''

ستارساحرؔ

پروفیسر و سابق صدر شعبۂ اردو

مکان نمبر۔5/228

کڈپہ۔516001، اے پی

●●●

غالب کے آئینے میں یسیر

محقق اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو کتابی شکل اس امید سے دیتا ہے کہ ادبی سرمائے میں اضافہ کا سبب بنے اور اس کا نظریۂ ادب آنے والی نسلوں کے لئے کارآمد ثابت ہو، تحقیقی وتنقیدی کتابیں دھڑادھڑ چھپوا تو سکتے ہیں مگر زبردستی پڑھوا نہیں سکتے ۔ یہ مضامینِ ادب ان محققین کے لئے اس لئے بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں جب وہ اپنا مقالہ جامعہ میں پیش کر کے اپنی اسناد کی فہرست میں اضافہ کر سکے۔ یوں تو جامعہ کے کتب خانوں میں مقالہ نما مقالے الماریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں ان الماریوں کی زینت میں اس وقت دوبالا ہو جاتی ہے جب کسی محقق کا مقالہ کتابی شکل اختیار کر جائے ، بعض مقالہ تو چھپانے کے قابل ہوتے ہیں تو بعض چھپوانے کے قابل ہوتے ہیں۔ دنیائے ادب میں خوشی کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب کوئی محقق اپنے تحقیقاتی نظریات کو مختلف انداز میں پیش کرے اور اس کا ہر نظریہ معلومات کا خزینہ بن جائے ، اور لطفِ خواندگی میں اضافہ ہو جائے۔

ادب عالیہ میں آئے دن کئی تحقیقی مقالے کتابی شکل اختیار کر چکے ہیں ان میں کئی شخصی تحقیقی مقالے ہیں۔ ادب میں اس وقت خوش گوار ماحول پیدا ہوتا ہے جب خواتین کے تحقیق بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ اکثر و بیشتر ادب کے میدان میں خواتین کے ناول ، افسانے ، شاعری ، اور تحقیقی مضامین نسائی اور نفسیاتی کیفیات کو اجاگر کرنے اور شاعری میں خیالات وتصورات کو جذباتی بنانے کے قابل ہوتے ہیں لیکن کم ہی ایسے مقالے پڑھنے کو ملیں گے جن میں ادبی مشک و عنبر کی مہک گلستانِ تحقیق ادب کو معطر کرتی ہیں۔ ایسی مہک پھیلانے والی ایک نایاب تحقیقی کتاب بعنوان ''عکسِ غالب'' پر قلم فرسائی کرنے کا موقعہ ملا ہے جس کے نام کے دو پہلو ہیں غالب اور عکس ، اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ غالب اور عکس کا تعلق استعاراتی طور پر استعمال کیا گیا

ہے جس میں موصوفہ ڈاکٹر محبہ نے غالبِ دکن یسیر کرنولی کے شعری و رومانی خصوصیات کو غالب کی شعری رومانیت سے امتزاج کرتے ہوئے ادب کا سرا اونچا کرنے کی سعی کی ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ ناقدین وقت ادب کا سر کتنا اونچا ہونا پسند کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ امیر علی خاں یسیر کرنولی کی شاعری کے پیچ وخم اور مشکل پسندی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوں اور شاعری کے حسن وخوبی کے مختلف النوع خصوصیات کو اجاگر کرنے کی جدوجہد قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھیں گے، بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یسیر کی شخصیت اور شاعری، ایک ایسے گلدستے کے مثل ہے جس میں رنگ برنگے پھول کا اجتماع ضدین کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر محبہ نے یسیر کرنولی کے جذبات واحساسات کی شاعری کے علاوہ ان کے وجدانی کیفیات کو غالب کی شاعری سے معائنہ کرتے ہوئے رومانیت کے عناصر کے تحت ان کے اشعار کی وضاحت کی ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے موصوفہ نے مغربی ناقدین ورومانی شعراء کے حوالوں کو بھی پیش کیا ہے مثلاً جان کیٹس John Keats کا یہ جملہ ''حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے'' یعنی حسن کی صداقت اور صداقت کے حسن کو بروئے کار لاتے ہوئے جن شعراء نے اپنے جذبات موزوں کیا ہے وہ رومانی شعراء کہلانے کے قابل مانے جاتے ہیں۔ ''رومانیت افکار واثرات'' میں موصوفہ نے بڑی عمدگی سے رومانیت کے آغاز وارتقاء اور اس کی خصوصیات کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ چونکہ یسیر کرنولی ایک باشعور، نازک مزاج اور انسانی اور قدرتی فطرت کے نباض اور وسیع القلب شاعر ہیں۔ جن کی شاعری میں غالب کی غالبیت اور رومانی خوبیوں کی وجدانیت کا امتزاج بخوبی پایا جاتا ہے، جس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہوجاتا ہے۔ یسیر کی شاعری میں آمد، برجستگی اور انفرادیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، جو رومانیت کے اہم عناصر مانے جاتے ہیں۔ اردو ادب میں رومانیت کبھی کسی تحریک کی شکل میں رونما نہیں ہوئی اردو شعراء نے رومانیت کو حسن وعشق کا مرکز مانا ہے اور رومانیت کے آئینے سے اپنی شاعری کو رنگین بنانے کی سعی کی ہے۔

غالب کے آئینے میں یسیر کی شخصیت، مذہبیت اخلاقیت، جذباتیت اور رومانیت کو دیکھتے ہوئے موصوفہ نے امیر علی خاں یسیر کرنولی کی شعری خصوصیات کو نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ کلاسیکی، رومانی شعراء کے حوالوں سے رومانیت کے تحت بنیادی اور ضروری معلومات فراہم کیا ہے، یوں تو

غالب دکن یسر کرنولی کی شاعری مشکل پسندی کے ساتھ مختلف النوع موضوعات کا دلکش مجموعہ ہے، مضامین اور موضوعات کو منفرد اور دلنشیں انداز میں پیش کرنے کا ہنر یسیر کرنولی کو آتا ہے اس لئے ناقدین وقت نے ان کی شخصیت، شاعری اور ان کی شاعری کے اسلوبیاتی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے ادب میں بیانیہ میزان کے آئینے میں ان کو دیکھنے کا فعل انجام دیا ہے۔

موصوفہ ڈاکٹر محبہ وِنٹموری واقعی مبارکباد کے قابل ہیں یوں تو ان کا تعلیمی سلسلہ ریاست آندھر پردیش اور کرناٹک کے مدارس اور یونیورسٹیوں میں ہوا ہے، انہوں نے جہاں قدم رکھا جس ادبی فضا میں سانس لی، وہاں کے ادیبوں اور نقادوں کی ادبی خدمات کا مطالعہ کیا اور ان کی ادبی تخلیقات سے متاثر ہوکر ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے اس مجموعے کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک خوش فکر ادیبہ ہیں جن کی تحریروں کو پڑھ کر قاری ادب کے مسائل پر سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے لگتا ہے۔

الغرض ان کی یہ کتاب ''عکسِ غالب'' کی انفرادیت ادبی دنیا کو ضرور متاثر کرے گی۔

ڈاکٹر امام قاسم ساقی

D.No:39/107/128-3A
S.N. COLONY(WEST)
RAYACHOTI 516269
CELL: 9059148786

●●●

گفتنی

دستِ تحقیق کے قلم سے جب حُسن کی جولانیاں صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں تو ماضی اور حال کے اندھیرے دور ہوجاتے ہیں اور خوشبوئے ماضی کی مہک حال کے گلستان کی سیر کراتی ہے۔ اسی حالت میں میں نے شہر کرنول کے ادبی فضا کو محسوس کیا تو وہاں کی ادبی مہک نے میرے ادبی دبستان میں کئی گل کھلائے جس کی بدولت میں نے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز وہیں سے کرنا شروع کردیا۔

یوں تو میرا فطری رشتہ شہر کرنول سے تھا، میرا بچپن، میرے شباب کی انگڑائیوں نے میرا استقبال کیا اور مجھے تحقیقی دنیا سے وابستگی کرتے ہوئے میں نے ڈاکٹر وحید باشاہ قادری صاحب کی نگرانی میں ایم۔فل کے دوران یسیر کرنولی کی شاعری کا مطالعہ کیا اور ان کی شاعری میں رومانیت کا چسکہ میرے فطری جذبات کو چھونے لگا اور رومانی شاعری کی طرف میرا رجحان بڑھتا گیا، اسی نسبت سے میں نے یسیر کرنولی کی شاعری میں رومانیت پر اپنا تحقیقی کام کرتے ہوئے ان کی شاعری میں جو رومانیت کی جھلکیاں پائی گئیں ہیں ان کا احاطہ کیا ہے۔

اس کتاب کا اہم عنوان ''کلام یسیر میں رومانیت'' ہے۔ اس کتاب میں مختلف رومانی ناقدین اور ان کے نظریات کو پیش کرتے ہوئے یسیر کرنولی کے کلام سے حوالے دیا گیا ہیں۔ یسیر کی رومانیت اپنی ذات کی اساس پر بغیر کسی ہیجان کے حقیقت کی گہرائی تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ اس ذات کا ادراک کرنا اتنا آسان بھی تو نہیں کہ سازِ ہستی نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ یسیر کا ذوقِ دیدار کس قدر کائنات حسنِ حقیقت تک رسائی کے لیے بے چین ہے۔ اس کی تفہیم کے لیے زیادہ سے زیادہ اشعار پیش کرنے کی سعی دراصل اس لیے ہے کہ کلام میں موجود رومانیت کو نمایاں کیا جاسکے۔

خود یسیرؔ کرنولی نے بھی اپنے رومانی شاعر ہونے کا ذکر وانمباڑی اسلامیہ کالج کے ایک مشاعرے کی صدارت کے دوران کیا ہے۔ اس خطبۂ صدارت کی ایک کاپی راقمۃ الحروف نے اپنے استاد محترم ڈاکٹر سید وحید کوثر صاحب سے حاصل کی اور یہی کتاب کی روح ہے۔ مجھے یہ بات بتاتے ہوئے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر وحید کوثر صاحب میرے ایم۔فل کے نگراں بھی ہیں اور خود وہ راست طور پر شاعری میں یسیرؔ کرنولی کے تلمیذ ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔

شہر کرنول کی تحریکی رجحانات اور شعراء کا عنصر پیش کرتے ہوئے میں نے اسے ایک کتابی شکل دی ہے، جو آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنی محبت بھری نظروں سے اس کتاب کا مطالعہ کریں گے اور رومانیت بھرے اشعار کا لطف اٹھائیں گے۔

ڈاکٹر محبہ ونٹموری

●●●

ضلع کرنول کا ادبی وثقافتی پس منظر

شہر کرنول ایک ایسی ادبی زرخیز زمین ہے جہاں صدیوں سے علم و ادب اور تصوف کی خدمات ہورہی ہیں۔ یہاں کے اکثر صوفیائے اکرام اردو کے بہترین شاعر ہیں۔ان ہی کے فیض سے یہاں کے علمی وادبی اداروں اور محفلوں کا قیام عمل میں آتا رہا ہے۔ان صوفیائے اکرام نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں اور یہاں کی شعری محفلوں کی سرپرستی فرمائی ہے۔ نوابان کرنول نے بھی صوفیائے اکرام سے روحانی، علمی وادبی فیض حاصل کیا ہے۔نوابان کرنول میں بھی ایسے افراد ملتے ہیں جو فارسی اور اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔نواب اَلف خاں بہادر اور نواب اکبر خاں کے کلام کے نمونے آج بھی دستیاب ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کرنول میں ابتداء ہی سے خداترسی محبت اور اخوت کی فضا بنی رہی ہے۔حاکم اور رعایا میں خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ بزرگان دین کی تعلیمات نے بھی فرقہ واریت کو جنم لینے نہیں دیا۔اگر کبھی ایسا موقع بھی آیا کہ فرقہ واریت کے پھیلنے کے امکانات پیدا ہوئے ہوں تب بھی ان ہی بزرگوں کے روحانی فیض نے یکجہتی کو ٹوٹنے سے بچالیا ہے۔ یہاں کا ہندو مسلم اتحاد صدیوں سے اپنی مثال آپ رہا ہے۔

نوابان کرنول کی یہ اہم خصوصیت رہی ہے کہ وہ جمہوریت کے اصول کو اپناتے ہوئے کبھی ذات پات کے نام پر رعایا میں تفریق نہیں کی ان کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ یکساں رہا۔کرنول کے آخری نواب غلام رسول نے ۱۸۳۳ سے ۱۸۳۸ء تک صرف پانچ سال تک حکمرانی کی۔تاہم ان پانچ سالوں میں آپ کی فہم وفراست، دلیری و بہادری حق شناسی وحق گوئی وبے باکی، فیاضی اور اخلاقی کے چرچے عام ہو چکے تھے۔غلام رسول خاں کو ایک اہم مجاہد آزادی کی حیثیت سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''غلام رسول خاں کرنول کے آخری تاجدار تھے اور راقم کے دل میں ان کا وہی مقام ہے جو حیدر علی، ٹیپو سلطان، نانا فرنویس جھانسی کی رانی کا ہے ۱۸۳۹ء میں غلام رسول خاں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اسکیم بنائی اور اس اسکیم کے تحت کرنول میں ایک زمین دوز اسلحہ خانہ اور بارود خانہ قائم کیا گیا لیکن وقت سے پہلے یہ راز فاش ہوگیا۔ غلام رسول خاں گرفتار ہوگئے اور ریاست کو انگریزی عملداری میں شامل کرلیا گیا۔ اس وقت بھی جانباز سپاہیوں نے جنگ شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن غلام رسول خاں کو چونکہ رعایا کا خون ناحق گوارا نہ تھا انہوں نے یہ کہہ کر کہ اب فتح کا امکان باقی نہیں رہا اس امر کی اجازت نہ دی۔ بعد میں غلام رسول خان رہا ہوکر ترچنا پلی چلے گئے جہاں اپنے ہی ایک سپاہی کے ہاتھوں قتل ہوگئے۔ (جنوبی ہند میں چھ ہفتے از جگن ناتھ آزاد، ص۔ 67)

ضلع کرنول میں نوابوں کے زوال کے بعد یہ علاقہ صوبہ مدراس کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا۔ اس وقت نہ آندھرا پردیش کا وجود تھا نہ کرناٹک و کیرالا کا۔ یہاں کے وہ جانباز سپاہی جو کبھی غلام رسول خان کی عملداری میں رسالدار کہلاتے تھے۔ بڑے جیالے اور جانباز پٹھان سمجھے جاتے تھے۔ نواب کی جانب سے انھیں جائیدادیں عطا کی گئی تھیں۔ نواب کے اسیر ہوکر ترچنا پلی چلے جانے کے بعد بھی کرنول ہی میں رہے۔ ان خاندان کے افراد نے بعد میں بھی اپنی بڑائی کو باقی رکھا۔ اپنی سوچ اور سیاسی تدبر سے ہر دور میں یہاں کے لوگوں کی رہبری و رہنمائی کرتے رہے۔

یہاں کے لوگوں کی تعلیم اور شعر و ادب کی سرپرستی کا شعور ان نوابوں میں ہمیشہ باقی رہا۔ غلام رسول خان کے فرزند داؤد خان نے کرنول میں عربی مدرسوں کے قیام اور شعر و سخن کی طرف رغبت دکھائی۔

مدرسہ اسلامی کرنول کا قیام 1894ء میں عمل میں آیا اس کا پہلا دستار بندی کا جلسہ 1901ء میں نواب داؤد خان بہادر کے شاہی محل میں منعقد کیا گیا۔ اس کے قدیم طالب علم مولانا عرشی ''رودِ کوثر'' میں لکھتے ہیں کہ 1908ء میں دریائے ہندری کی طغیانی کے بعد مدرسہ کی عمارت

منہدم ہوگئی تو مولانا سلطان احمد راولپنڈی (جو مدرسہ شوکت الاسلام رنگون کے بانی تھے) منہدم شدہ عمارت کی تعمیر اور دارالاقامہ وغیرہ تعمیر کروایا۔ نواب داؤدخان بہادر نے جب اس مدرسہ کی مالی حالت خراب ہوئی تو اس کی مالی اعانت فرمائی۔

نواب داؤدخان کے بعد ان کے فرزند نواب شجاع الملک نے بھی اس مدرسہ کی امانت میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان دونوں باپ بیٹے کو علم وادب اور شعروسخن سے فطری لگاؤ تھا۔ فارسی کا اثر کم ہوتا گیا تو اردو زبان اور شعروادب کو بھی تیزی سے ترقی کرنے کا موقعہ ملا۔ غرض کرنول میں اردو شعروادب نوابان کرنول کی سرپرستی صوفیائے کرام کی تبلیغی کوششوں وکاوشوں اور عوام کی اس زبان سے دلچسپی کی بدولت ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا اور یہ زبان عوام اور خواص کی محبوب زبان بن گئی۔ غیر مسلم بھی اس زبان میں بات چیت کرنے، لین دین اور کاروبار کی ضرورتوں کی تکمیل میں اس کا استعمال کرنے لگے۔

یہاں اردو شاعری کا آغاز خواجہ نور الدین چشتی رحمتہ اللہ اور وجہ الدین وجدی کی مثنویوں سے ہوجاتا ہے لیکن اس میں وسعت حضرت سید شاہ عبدالطیف قادری لا اُبالی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت سید شاہ عبد القادر قادری فی الحال رحمتہ اللہ علیہ کے خاندانوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دوخاندانوں کے افراد نے بالخصوص تبلیغ اسلام اور اصلاح معاشرہ کے پیش نظر جوادب تخلیق کیا وہ زیادہ تر نظم ہی میں ہے اور اخلاقی ومذہبی نوعیت کا حامل ہے۔ ان کے رشحات میں چکی نامے شادی نامے، چرخہ نامے، بیت نامے، سخاوت نامے، بودنامے، جھوجھو نامے جیسی مثنویاں ہیں یہ سارا سرمایہ اردو کے قدیم ادب کا حصہ ہے ان شعراء نے غزلوں کے دیوان بھی ترتیب دیئے ہیں۔ صدیق قیسی قمرنگری نے اپنے ایک مضمون ''کرنول کے صاحب دیوان شعراء'' میں کوئی چھ شعراء کا ذکر کیا ہے جن کے اردو دیوان آج بھی دستیاب ہیں۔ ان شعراء کی غزلیں تصوف کے موضوعات پر ہیں۔ ہر شاعر کے کلام میں تصوف کا رنگ گہرا ہے۔ اس کے علاوہ پندواخلاق کے موضوعات پر بھی اشعار مل جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتداء تک یہاں یہی رنگ شاعری دیکھنے میں آتا ہے۔ مذکورہ کئی مثنویوں کے اشعار یا گیت یہاں خواتین میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں جو شادی بیاہ، پیدائش اور مختلف تقاریب میں گائے جاتے تھے۔ ڈھولک کے گیت اور مراثنین کا ایسی تقاریب میں شریک ہونا اور گیت پیش کرنا عام رواج سا تھا۔ گیت گانے والی

مراثیوں کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔

کرنول میں شعری محفلوں کا رواج زمانہ قدیم ہی سے تھا لیکن اولیاء اللہ کے اعراس کے موقعوں پر اس کا رواج کس طرح ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرحیم لکھتے ہیں:

''کرنول کو باون ولیوں کا مٹھ کہا جاتا ہے جن میں حضرت لطیف الاُبالیؒ، حضرت معصوم باشاہ قادری اور دیگر اولیائے اکرام بہت مشہور ہیں۔ ان بزرگوں کے عرس ہر سال بڑی عقیدت واحترام سے منائے جاتے ہیں۔ دیگر مراسم کے علاوہ منقبت بازی (کرنوں کی زبان میں مناقب بازی) ایک اہم محفل ہوتی تھی۔ عرس کے موقعہ پر جب چراغاں ہوتا تو رات میں درگاہ کے مقام پر کئی ذی علم احباب منقبت سنایا کرتے تھے جو مسدس یا مخمس کی شکل میں ہوتے تھے جن میں صاحب درگاہ کے احوال اور کشف و کرامات کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ سینکڑوں عقیدت مند بڑے انہماک سے ہی منقبت سنا کرتے تھے۔ میں نے کرنول کے بزرگ شاعر حضرت جوہر (مرحوم) کو ایسی محفلوں میں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ افسوس کہ نمونہ کلام کے طور پر کچھ پیش کرنے کے موقف میں نہیں ہوں۔ عالم پور میں حضرت شاہ علی بادشاہ حسینی سیدؒ کا مزار مرجع خاص و عام ہے جہاں پر ہر سال عرس ہوا کرتا ہے۔ تلنگانہ ہی نہیں بلکہ رائلسیما کے عوام بھی عرس میں شریک ہوتے ہیں جو تین دن تک جاری رہتا ہے۔ وہاں بھی پہلے منقبت بازی ہوا کرتی تھی مگر بعد کو مشاعروں کا انعقاد ہونے لگا۔ عالم پور میں مرزا سیمابؔ رگھویندر راؤ جذبؔ عالم پوری، نارائن راؤ فاشؔ اور عمادالدین مقبول وغیرہ جیسے بڑے اچھے شاعر تھے۔ ان لوگوں نے عرس کے آخری دن مشاعرہ کے منعقد کرنے کا رواج ڈالا۔ یہ مشاعرے عام طور پر طرحی ہوا کرتے تھے چنانچہ میں نے عالم پور میں پہلی مرتبہ ایک ایسے مشاعرے میں اپنا کلام سنایا تھا جس کا مصرعہ طرح تھا۔ ع ''عمر حیات جاودانی اہل دل کی زندگانی ہے۔'' پھر ہم لوگوں کو بھی یہ خیال آیا کہ کیوں نہ کرنول میں بھی اعراس کے موقعہ پر مشاعرے منعقد کئے جائیں چنانچہ اسی طرح کا ایک مشاعرہ حضرت لطیف لااُبالی کے عرس کے

موقعہ پر بھی ہوا جس کا مصرعہ طرح تھا۔ ع لطیف لا اُبالی وارثِ محبوب سبحانی۔''
اسی طرح عرس کے موقعوں پر بھی مشاعرے ہونے لگے۔''
(وہ محفلیں الٰہی دوسری قسط، ماہنامہ پیکر خوشبو، جولائی 1982ء، ص۔23,24)

آج بھی یہاں منقبتی طرحی مشاعرے کرنول کی بارگاہوں پر اعراس کے موقع پر ہوا کرتے ہیں۔ان مشاعروں میں آج کل نہ صرف مقامی شعراء اپنا کلام سناتے ہیں بلکہ حیدرآباد، ادھونی، بلہاری، رائچور اور بعض وقت تو شمالی ہند کے شعرا بھی ان اعراس کے نعتیہ و منقبتی مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا کلام سناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے نعتیہ مشاعرے ماہ ربیع الاول میں منقبتی مشاعرے ماہ ربیع الثانی اور ماہ محرم الحرام میں بھی منعقد کیے جانے لگے ہیں۔شعراء کی کثیر تعداد کے علاوہ سامعین بھی بڑی عقیدت و احترام سے ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ ماہ رمضان میں روزے داروں کو سحری کے لئے جگانے اور خود ثواب حاصل کرنے کے لئے بھی کرنول میں شاعری کا رواج ایک مدت سے چلا آرہا ہے۔

تمؔ کرنولی لکھتے ہیں:

''سحر کا وقت نہایت صبر آزما ساعتوں میں شروع ہوتا ہے۔ جب انسان پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت روزے داروں کو جگانا بھی ثواب میں شامل ہے کئی لوگ یہ فریضہ انجام دیتے ہیں جو اکثر فقیر لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جو رات کے ایک بجے سے ہی گلیوں میں آواز لگایا کرتے تھے، سحری کا وقت ہو گیا سحری کرو اٹھو، ساتھ ہی وقت بھی بتایا کرتے تھے بعض خاص خاص گھروں میں زنجیر ہلا کر جگایا کرتے تھے، رمضان کے اختتام پر لوگ روزہ داروں سے معاوضہ بھی پاتے تھے علاوہ اس کے بعض درگاہوں اور مسجدوں میں بڑے بڑے نقارے ہوا کرتے تھے جو ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے بجائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں اس زمانے میں حیدرآباد کی حکومت نظام کی جانب سے توپیں داغی جاتی تھی۔ چناں چہ کرنول میں توپ کی جگہ آوٹ'' (بارود کے گولے) چھوڑے جاتے تھے جن کی آواز سے سحر کا آغاز اور اختتام ہوا کرتا تھا) سحری کے وقت نوجوانوں کی کئی جماعتیں

گشت کرتی اور قصائد سناتی تھیں۔ جان پہچان والے احباب کے گھر بھی جماعتیں قصیدہ خوانی کرتیں۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ پڑوس کے لوگ بھی مستفیض ہوا کرتے تھے، ہر ایک جماعت میں دو یا تین خوش نوا (سوالی) ہوتے تھے جو نہایت اچھے انداز میں قصیدے پڑھتے تھے اور باقی لوگ ہمنوا (جوابی) قصیدے کے مطلع کو دہراتے رہتے تھے، یہ روایت کرنول کا خاصہ تھی اور ہے۔ میں نے کسی اور جگہ یہ چیز نہیں دیکھی۔''

(وہ محفلیں الٰہی وہ محفلیں الٰہی دوسری قسط، ماہنامہ پیکر خوشبو، جولائی 1982ء، ص۔31)

مندرجہ بالا قصائد کو مرتب کر کے قاضی کریم الدین زعیم نے ایک گلدستہ ''نوید رمضان'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر قیسی قمر نگری اپنے مقالے ''کرنول کا اردو ادب میں حصہ آزادی سے پہلے'' میں لکھتے ہیں:

''قصائد رمضان کے باوا آدم کے طور پر ہم قاضی کریم الدین زعیم کا نام لے سکتے ہیں جن کی کتاب ''نوید رمضان'' کرنول ہی کے ہیں اردو کے تمام شاعروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ کرنول میں عبد الرحمٰن کا سب عبد الرحیم غم عبدالرحمٰن جوہر رضی البحاری، کمسن عبدالرحمٰن خان نصرت (جو بعد کو ناصر کرنولی ہوئے) قصائد نویسی میں بے حد مشہور ہوئے۔ روایاتاً ہر ٹولی شاعری کے نام سے موسوم ہوا کرتی ہے۔ جیسے جماعت کا سب، جماعت غم، جماعت جوہر، کمسن، جماعت ناصر وغیرہ۔ شعراء کرام ماہ رمضان کی آمد، شب قدر کے فضائل اور ماہ رمضان کے اختتام جیسے موضوعات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ جیسے پہلے عشرہ کے گیت میں رمضان کا استقبال ہوا کرتا تھا۔ ماہ رمضان کے اختتام پر وداعیہ اشعار کی مغموم انداز بیان میں شعر گوئی بھی بڑی پر لطف ہوا کرتی ہے۔'' (مقالہ کرنول کا اردو ادب میں حصہ آزادی سے پہلے، ص44)

رمضان کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے شعراء اکرام اپنی فنی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا

کلام، رمضان کے آنے سے پہلے لکھ کر ان کو پڑھنے والوں کو دے دیا کرتے تھے تاکہ پڑھنے کی مشق کر لیں۔ حضرت یسیؔر نے بھی ایسے قصائد لکھے تھے لیکن اپنے نام سے کوئی جماعت منسوب نہیں کی۔ یسیؔر کے لکھے ہوئے رمضان کے قصائد ان کے محلہ کھڑک پورہ کے نوجوان پڑھا کرتے تھے۔ عید الفطر کے دوسرے روز ان جماعتوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا تھا۔ ہر جماعت اپنی جماعت کا بہترین قصیدہ پڑھتی تھی اس کے جج بھی ہوتے تھے۔ ججوں کو جس جماعت کا قصیدہ زیادہ پسند آتا اس کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ ایسے جلسوں کے جج کے فرائض حضرت یسیر نے بھی انجام دیئے تھے۔ یہ محفلیں عوام میں شاعری کے ذوق کو اُبھارنے کا کام انجام دیتی تھیں۔ ان کی اہمیت مشاعروں سے کم نہ تھی۔ ایسی ہی فی البدیہہ، بیت بازی محرم کے مہینے میں ہوا کرتی تھی۔ کرنول میں جب محرم بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اس کے منانے میں عقیدت واحترام کا مظاہرہ کرتے تھے۔ علم استادہ کیے جاتے۔ عاشور خانوں پر عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ محرم کی آٹھویں نویں اور دسویں کی شب دلچسپ پروگرام ہوتے تھے۔ ان میں بھیس بدل کر کئی لوگ دوسروں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے تھے۔ اسی طرح فی البدیہ بیت بازی کا بھی انعقاد ہوتا تھا۔ یہ گویا ایک ہزل گوئی کا مقابلہ تھا۔ بھانڈ پھکڑ سنانے کے علاوہ ایک دوسرے پر اشعار میں لعن طعن کی جاتی تھی۔

امیر علی خان یسیؔر نے بھی ایسے کئی بھانڈ اور پھکڑ اور پھکڑ فی البدیہ تصنیف فرما کر اپنے گروہ کو دیا کرتے تھے۔ اس سے ہر چند اخلاقی پستی کا اظہار ہوتا ہے لیکن غیر تعلیم یافتہ طبقہ اردو شعرو شاعری کا دلداہ ہو جاتا تھا۔ یہی وہ روایت ہے جو آگے چل کر طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو رواج دینے میں معاون ثابت ہوئی۔ محرم کی عام تقریبات کو بند کر دیا گیا لیکن رمضان المبارک میں سحری کو بیدار کرنے والی جماعتیں آج بھی ہیں لیکن جو قصائد لکھے جاتے ہیں وہ اب فلمی گانوں، گیتوں اور غزلوں کی لحن پر لکھے جا رہے ہیں۔ چند سال قبل تک سوؔز یسیری کی جماعت اس طرح کے قصائد کے سنانے میں زیادہ مقبول تھی۔

یہاں سماجی رسم ورواج کے ادب وشاعری پر اثرات سے ذرا ہٹ کر اگر ہم خالص ادب و شاعری کے ماحول پر نظر ڈالیں تو بیسویں صدی کی ابتداء سے ہی یہاں اچھے شاعروں کی کمی نہیں۔ اسلامیہ کالج کا قیام، مولوی محمد عمر صاحب کی تعلیمی وادبی خدمات نے عوام میں اپنے بچوں

کو تعلیم دلوانے کا شعور پیدا کر دیا تھا۔ سلیمؔ، عاصیؔ، نواب طلعت خان کاسبؔ، جوہرؔ، عابدؔ، ساجدؔ، اظہرؔ جیسے شعرا نے کرنول کے ماحول میں شاعری کے ذوق کو پروان چڑھایا۔ اس دور میں شعراء کی ایک بزمِ سخن کے نام سے شہر میں مشاعروں کا انعقاد کیا کرتی تھی۔ یسیرؔ کا بیان ہے:

> ''1926ء میں جب کہ مقامی بزم سخن کے سالانہ مشاعرہ کی شہر میں کافی تشہیر ہوئی تو خیال ہوا کہ میں بھی چلوں اور دیکھوں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ چناں چہ میں اس مشاعرے میں پہلی بار بحیثیت سامع شریک رہا محفل پسند آئی۔ ارادہ کیا کہ میں بھی شعر کہوں۔'' (نفیر شوق از امیر علی خان یسیر، گفتی، ص۔34,35)

علامہ یسیرؔ کرنولی کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا کہ مولانا سید غضنفر علی زیدی کا تقرر اسلامیہ کالج کرنول میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ہوا وہ احسن مارہروی کے تلامذہ سے تھے۔ حضرت یسیرؔ نے ان کے کرنول آنے کا زمانہ 1938ء بتایا ہے۔

ڈاکٹر وحید کوثر کا خیال ہے:

> ''زیدیؔ نے کرنول میں اپنی عمرِ عزیز کے ستائیس ۲۷ سال گذارے۔ ان ۲۷ سالوں میں انھوں نے زبان کے ایک قابل استاد کی حیثیت سے طالب علموں کو شعر و ادب سے قریب کیا......... نتیجہ کے طور پر زیدیؔ کے کئی شاگرد شاعر، ادیب اور افسانہ نگار ہوئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زیدی شمالی ہند کے باشندے تھے۔ حصول روزگار کے سلسلے میں کرنول آئے تھے مگر انھوں نے کرنول ہی کو اپنا وطن بنالیا اور یہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔ انھیں یہاں شہرت بھی ملی اور عزت بھی۔ جب تک وہ زندہ رہے بہار شعر و سخن بن کر رہے چمن علم و ادب کی آبیاری کرتے رہے اور آج ہم انھیں ہمارے علاقے کے شعراء میں شمار کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر وحید کوثر۔ شناخت۔ اقبال خسرو قادری، مکتبہ کمبل پوش کرنول، ص۔5,6)

دکن کے اس علاقے میں جب غضنفر علی زیدی تشریف لائے تو شمالی ہند میں ہو رہی سماجی،

سیاسی اور ادبی تبدیلیوں سے وہ خواب آگاہ تھے۔ بالخصوص شعر و ادب میں جو نئے رجحانات اور نئی تبدیلیاں آرہی تھیں زیدی اس کے عینی شاہد تھے۔ غزل کی جگہ نظم کو شہرت مل رہی تھی۔ غزل میں بھی عشقیہ شاعری کی جگہ رومان پسندی اور ترقی پسندی جگہ لے رہی تھی۔

غضنفر علی زیدی نے ان تبدیلیوں سے نہ صرف اپنے طلباء کو آگاہ کیا بلکہ ان کو بھی جو شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور زیدی کی شاعری میں شاگردی اختیار کر چکے تھے۔ دوسری طرف حضرت یسیرؔ نے اپنے مطالعے سے اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم کے دوران ادب اور شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگہی حاصل کر لی تھی۔ وہ ایک طرف غالب کی فکر کی بلندی، فلسفیانہ گہرائی، تشبیہات، استعارات اور مشکل پسندی سے متاثر ہوئے تھے تو دوسری جانب شاہ نصیرؔ، شاد عظیم آبادی اور فانیؔ جیسے شعراء سے بھی اثر قبول کیا تھا لیکن ان کی رومان پسندی نے ان کی اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ یسیرؔ کے کلام میں عشقیہ شاعری کے عناصر بھی ہیں۔ تغزل بھی ہے اور رومانیت کی گہری چھاپ بھی ہے۔

علامہ یسیرؔ نے کرنول میں جب شاعری شروع کی تو یہاں کا سبؔ، جوہرؔ، زیدیؔ، رضیؔ البحاری، محمد ابراہیم آثمؔ، عبدالرحیم تمؔ وغیرہ موجود تھے۔ ان میں چند وہ تھے جو قدیم طرز کی شاعری کے نمائندہ تھے اور نوجوان طبقہ تھا وہ شعر و ادب میں آنے والے نئے رجحانات سے متاثر ہو رہا تھا۔ ان کی طرز شعر گوئی میں کافی بدلاؤ آرہا تھا۔ یسیرؔ نے بزمِ ''سخنستان'' کی بنیاد ڈالی۔ اس بزم کے ہر ماہ مشاعرے ''کاشانہ معذور'' میں ہوا کرتے تھے۔ اس دور میں ''بزمِ شعراء'' بمبئی کی ایک شاخ بھی کرنول میں مشاعرے کرانے میں سرگرم تھی جس کے صدر سید لطیف پاشاہ قادری لطیف تھے۔ معتمد حاجی میاں غازی تھے۔ اس شاخ کی ایک اور شاخ قائم ہوئی جس کے معتمد بشیر احمد بشیرؔ تھے۔

اس بزم کے اہم شعراء میں نذیر احمد رہبر اور قیسی قمر نگری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں دہے تک پہنچتے پہنچتے کرنول میں شعر و ادب کا جو ماحول تیار ہو گیا وہ کسی بھی ادبی مرکز سے کم نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 1947ء میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کرنولی کی کوششوں سے ایک علمی ڈگری کالج ''عثمانیہ کالج کرنول'' کے نام سے قائم ہوا اس میں شعبہ اردو، عربی اور فارسی کا قیام بھی عمل میں آیا طلبائے کرنول کے علاوہ دیگر

مقامات سے بھی یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلباء آیا کرتے تھے۔ انھیں بھی شعبہ اردو، عربی اور فارسی کے اساتذہ سے اپنی زبان اور کلچر سے واقف ہونے کا موقعہ ملتا تھا اور وہ اردو زبان کے شعروادب سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ کالج کے انتظامیہ کی جانب سے بھی مشاعروں کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے ایما پر یہاں امجد حیدر آبادی، علامہ اقبال، جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ادبی شاعر اور دانشور آئے اور یہاں کی شعری فضاء کو مزید پروان چڑھنے کا موقعہ ملا۔

●●●

رومانیت: افکار واثرات

تحریکِ رومانیت کلاسیکیت کے خلاف چلی تھی۔ رومانیت ایک خالص علمی وادبی اصطلاح ہے جسے عام طور پر قارئین بڑے ہی محدود مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ غلطی سے ایسی شعری تخلیقات کو جن میں حسن و جمال اور عشق و عاشقی سے متعلق خیالات کا اظہار کیا گیا ہو رومانی تحقیقات کے دائرے میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ حالاں کہ رومانیت اس سے ہٹ کر بھی بہت کچھ ہے۔ اگر حسن و عاشقی کے مضامین شعر میں باندھنا ہی رومانیت ہے تو پھر دنیا کی ہر زبان کا شاعر، رومانی شاعر کہلایا جاسکتا ہے۔ بات ایسی نہیں ہے۔ حقیقت حال کو جاننے کے لیے ہم کو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالنا پڑتا ہے۔

رومانیت دراصل کلاسیکیت کے خلاف ایک علمِ بغاوت بلند کرنے کا نام ہے۔ یہ ادبی بغاوت 18 ویں صدی میں شروع ہوئی اور ایک عظیم سیلاب کی طرح مغرب کے تمام ملکوں میں پھیل گئی۔ اس سے پہلے ادب پر کلاسیکی نظریات کی بڑی مضبوط پکڑ تھی۔ کلاسیکیت چوں کہ عقل اور فکر ہی کی برتری کو تسلیم کرتی ہے۔ کلاسیکی ادب سختی سے ہئیت، صحت زبان اور تخلیق شدہ مواد کو ہی پیش کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کرتا تھا۔ اس لحاظ سے کلاسیکی ادیب کا دائرہ تخلیق چند محدود مور چوں ہی پر نبرد آزما ہوتا تھا۔ میانہ روی، اعتدال اور تقلید کلاسیکیت کی بنیادی قدریں تھیں جن سے متجاوز ہونا تخلیقات کو ادب کے دائرے سے دور لے جانا تھا۔ اسی اصول پرستی، عقلیت، میانہ روی کے خلاف جن نظریات نے جنم لیا انھیں کو رومانیت کے عناصر قرار دیا گیا۔

کلاسیکیت کی بنیاد عقل اور فکر کی برتری پر ہے۔ اس کے یہاں انسانی جذبات واحساسات کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ انتہائی بے رحمی سے انسانی جذبات واحساسات کا قلعہ قمع کرتی ہے اور اس کے ڈھیر پر اپنے اصولوں کا مینار تعمیر کرتی ہے۔ اس کلاسیکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے رومانیت نے ایک انقلابی تحریک کا روپ اختیار کرلیا۔ اس بغاوت میں کامیابی اس لیے ہوئی کہ

18 ویں صدی عیسوی میں کلاسیکیت کے اصول پرانے معلوم ہونے لگے تھے اور نئے اصولوں اور قدروں کی بازیافت ضروری سی ہو چلی تھی۔

چناں چہ جلد ہی ہر وہ تحریک رومانیت سے وابستہ سمجھی جانے لگی جو اپنی سرشت میں انقلابیت کا جوہر رکھتی تھی اور قدیم طریقے سے خود کو الگ رکھتے ہوئے نئی قدروں کی بازیافت کا حوصلہ رکھتی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے برتان (Breton) اور ریڈ (Read) جیسے نقاد سوریلزم کو اعلیٰ رومانیت کا لقب دیتے ہیں۔ بعض ناقدین نے تو اور آگے بڑھ کر حقیقت پسندی، نیچرل ازم، سوریلزم اور اظہاریت کو بھی رومانیت ہی کی مختلف شکلیں قرار دیا ہے۔

''رومانیت'' کے معنی و مفہوم کو سائنس کے کسی ضابطے کی طرح بیان کرنا ممکن نہیں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''رومانس'' کا لفظ رومن زبان سے لیا گیا ہے۔ اس لفظ کے ساتھ تین خاص مفاہم وابستہ ہو گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ ایسی تمام چیزیں رومانوی کہلانے لگیں جن کا تعلق عشق اور محبت سے ہو۔ دوسرا یہ کہ ہر ''محاکاتی تفصیل پسندی، آرائش، آراستگی، فراوانی اور شان و شوکت کے اظہار کو رومانیت کہا جانے لگا اور تیسرا یہ کہ ماضی پرستی، قدامت پسندی اور عہد وسطیٰ سے متعلقہ تمام چیزوں سے لگاؤ کو رومانیت کہا جانے لگا۔

رومانی تحریک کے آغاز اور اس کے بنیادی نظریہ سے متعلق پروفیسر ظہور الدین نے لکھا ہے:

> ''رومانیت سے تعلق کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اسے تحریک کے طور پر سامنے لانے کا سہرا روسو کے سر پر ہے اور اس کے اس قول نے کہ انسان بنیادی طور پر معصوم ہے لیکن سماجی روایات و رسوم نے اسے گناہ کے جال میں پھنسا دیا ہے اور اس کی شخصیت کی دُرست نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ ان بندھوں سے آزاد کر دیا جائے۔'' رومانی تحریک کو تقویب پہنچائی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ اس کی بنیاد اسی نے رکھی، اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ روسو سے بہت سال پہلے اس ذہنی اور فکری انقلاب کا بیج بویا جا چکا تھا۔ انگلستان میں رومانی عناصر ہمیں روسو سے بہت پہلے اسپنسر (Spenser) اور ملٹن (Milton) کے ہاں ملنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں انیسویں صدی میں وڈز ورتھ کالرج نے جس تحریک کو شروع کیا اسے اسپنسر اور ملٹن کی ادبی قدروں

کے احیاء کے نام سے منسوب کیا۔“

(جدید ادبی وتنقیدی نظریات از پروفیسر ظہور الدین، ص۔57,58)

رومانیت کا آغاز1798ء میں جرمنی میں ہوا اور 1800ء میں کالرج کے Lyrical Ballads پر لکھے ہوئے دیباچہ میں گویا اس تحریک کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کردی۔ یوں تو عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس رجحان کی بنیادی خصوصیات تخلیق کی آزادی، آمد، آہنگ، خلوص، خیال کی آزادی، ایہام پرستی، قسمت اور خدا سے بغاوت، معنی خیزی، علامت نگاری اور پیکر تراشی وغیرہ ہیں لیکن وہ خصوصیت جسے اس تحریک کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے وہ اس کی داخلیت یا جذبہ و وجدان کی ترجمانی ہے۔

رومانی تحریک کلاسکی تحریک کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی اس لحاظ سے جب ہم ان دونوں تحریکوں سے متعلق رجحانات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو جو واضح فرق سامنے آتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ کلاسیکی شعراء کے پاس عقل ہئیت وفکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو رومانی شعراء کے یہاں وجدان اور جذبات کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ کلاسیکی شعراء خارجی وسائل کی مدد سے دنیا کی تعمیر کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور اس قدر خارجی دنیا کی تشکیل میں گُم نظر آتے ہیں کہ ان کے نزدیک داخلی دنیا کا تصور ہی مفقود ہو جاتا ہے جب کہ رومانی شعراء وجدان سے ایک ہی دنیا کی تعمیر کر لیتے ہیں جس میں ان کے سکون قلب کا سامان موجود ہوتا ہے۔

کلاسیکی شعراء ایک منظم سوسائٹی سے اپنا رابطہ وتعلق رکھتے ہیں جب کہ رومانی شعراء تمام خارجی قوانین سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیا آپ بنا لیتے ہیں ان کے نزدیک سچی آزادی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی اپنی من پسند دنیا میں جیئے۔ سماجی بندشیں، تہذیبی تصنع اور اخلاقی ضابطوں سے بھی رومانی شعراء منحرف ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف زندگی کی گھما گھمی سے دور دیہات، پُرسکون فضاؤں میں نیچر کی گود میں رہ کر زندگی گذارنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات وہ زمانے ہی کو پیچھے کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں جس میں سادگی، سچائی اور ہر طرح کی نیکی و پاکی موجود تھی جیسے اقبال نے نظم ”ہمالہ“ میں اپنے خیال کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

....

رومانی تحریک صرف کلاسیکی تحریک کے خیالات اور اندازِ فکر کے خلاف ہی بغاوت نہیں تھی بلکہ اس تحریک نے کلاسیکی شاعری کی زبان، بحور اور اسلوب سے بھی اختلاف کیا۔ ایک نئی زبان جو نہایت آسان دلکش اور دل نشیں ہو سکتی تھی ایجاد کی اور ایسی بحور کا استعمال اپنی شعری تخلیقات میں کیا جو مترنم تھیں۔ ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جس کی مٹھاس دوسری دنیا کی سیر کراتی ہے۔ علامت نگاری، پیکر تراشی اور معنی خیزی کو زیادہ اہمیت دی۔ سماجی جبر و استبداد کی سختی سے مخالفت کی۔ محبت ہی حقیقت ہے پیار ہی سچائی ہے اور حسن ہی صداقت ہے۔

کیٹس (Keats) نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ ''حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے'' رومانی شاعر کی تہہ میں جو غم کی لہر پائی جاتی ہے وہ ایک احساس شکست ہے جو غیر معمولی کے حصول کی خواہش اور اس میں ناکامی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رومانی شاعر اپنے ماحول اور سماج سے برگشتہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا باطنی توازن متزلزل نہیں ہوتا۔ وہ ظاہر میں جس نیکی پاکی، حسن اور پر سکون سماج کی تمنا رکھتا ہے۔ اس کے ملنے پر اس کا غم بے معنی نہیں لیکن اس کمی کو وہ اپنی خیالی دنیا میں زیادہ بہتر انداز میں پا لیتا ہے۔

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ''......... رومانی ادب میں تمام تر زورِ احساس، وجدان اور جذبے پر ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کو مرکز اور رومانی ادب کو مرکز گریز سمجھنا چاہیے۔ کسی نقاد نے رومانیت کو تحیّر کی نشاۃ ثانیہ کہا ہے میرا خیال ہے کہ رومانی تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ احساس کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ بنی۔''
>
> (علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر، ص۔ 125)

مغرب میں رومانیت کی ابتداء جرمنی سے ہوئی۔ شلیگل (Shelegel) اور شلینگ (Sehelling) اس کے علمبردار تھے۔ فرانس میں روسو کی کتاب Back to Nature سے

اس کی شروعات ہوئی۔ انگلستان میں ورڈز ورتھ اور کالرج کے مشترکہ مجموعہ کلام Lyrical ballads کے دیباچے سے اس کا آغاز ہوا۔ اٹلی میں مادام اسٹیل (Madam De-steel) کے لکھے ایک مضمون سے رومانیت کی ابتداء ہوئی۔ اس طرح سارے مغرب میں رومانیت ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

رومانی تحریک کی صورت گری میں ورڈز ورتھ کے اس دیباچے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جو اس نے Lyrical Ballads پر لکھا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس تحریک کا منشور ثابت ہوا۔ اس کے چند اہم نکات کا ذکر پروفیسر ظہور الدین نے اپنی کتاب ''جدید ادبی تنقیدی نظریات'' میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''اس دیباچے میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعری کے مواد سے متعلق بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ شاعر کو اپنا مواد عام زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے حاصل کرنا چاہیے اور اسے ایسی زبان میں بیان کرنا چاہیے جو اس کے ہم عصر بولتے ہیں۔ البتہ خیال کی رنگینی سے اسے عمدہ بنانے کی آزادی اس کو حاصل ہے۔ زبان گو عام فہم ہو لیکن ہو معیاری تا کہ وہ ادب کی عظمت کو برقرار رکھ سکے۔ وہ شاعری کو شدتِ جذبات کا فوری احساس اور اظہار قرار دیتا ہے اور اسے تمام فلسفیانہ تحریروں سے زیادہ فلسفیانہ تصور کرتا ہے۔ وہ شاعر کو ایک ایسا انسان سمجھتا ہے جو لاکھ انفرادیت کے باوجود دوسرے انسانوں میں رہتا ہے اور انھیں خطاب کرتا ہے۔ وہ تمام انسانوں سے زیادہ با شعور، نازک مزاج اور انسانی فطرت کا نباض ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع القلب بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے جذبات اور باطنی تجربات سے زیادہ محظوظ ہوتا ہے۔ ورڈز ورتھ شاعر کے لیے خیال کی بلندی کو سب سے اہم قرار دیتا ہے۔''
>
> (پروفیسر ظہور الدین، جدید ادبی تنقیدی نظریات، ص۔58)

رومانیت جذبے اور وجدان کے ساتھ احساس حسن و ذوق جمال کا منبع ہے۔ وجدان زماں و مکاں کی قیود سے آزاد نظر آتا ہے۔ رومانی شاعر وجدان کے سہارے فکر کی اس بلندی پر پہنچ جاتا

ہے جہاں خیال کے پر جلنے لگتے ہیں۔ اس کا ذوقِ جمال ہمیشہ ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہتا ہے۔

پھول حسین ہے دریا کی روانی دلکش ہے۔ شفق اور قوس وقزح کے رنگوں میں بلا کا جادو ہے۔ ہم انھیں دیکھتے ہیں اور ان سے لذت حاصل کرتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے خارج کی دنیا سے ہمارا تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور ہم ذوقِ جمال کی وجہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں دلِ مضطر نیچر کی رعنائیوں میں گُم ہو کر حسن سے محظوظ ہونے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس لذت کے سرچشمے کہاں سے پھوٹ رہے ہیں۔ حسن اور مظاہر حسن ہمارے وجدان کو تقویت پہنچاتے اور زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ یہ وہ جذبات واحساسات ہیں جو ہر انسان میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت اور عظمت کا احساس اجاگر کرنا ہی رومانی تحریک کا مقصدِ اصل ہے۔

رومانی تحریک والوں نے جب احساس اور جذبات پر زور دیا تو اس سے متعلقہ تین باتیں بھی اس تحریک کا جزو بن گئیں۔ چناں چہ شاعری میں آمد، برجستگی اور انفرادیت نے جگہ پائی ہے۔ اس طرح یہ خیال بھی عام ہوا ہے کہ فن اصولی طور پر ذاتی تاثرات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس خیال نے کلاسیکیت کی زنجیریں توڑ دیں اور شعر وادب سے متعلق جو پرانے نظریات تھے ختم ہو گئے۔ مغرب کے رومانی شعراء میں ورڈزورتھ، کالرج سے لے کر کیٹس تک بلکہ بیسویں صدی میں بھی ان خیالات نے شعر وادب کو متاثر کیا۔

اُردو ادب میں رومانیت کبھی کسی تحریک کی شکل میں رونما نہیں ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حسن وعشق کے تصورات عورت کا مرکز حسن ہوتا ہے۔ اس کی عظمت کا تصور وغیرہ قدیم اردو شاعری میں پہلے سے موجود تھے لیکن اس کو عشقیہ شاعری کا نام دیا گیا تھا۔ 1857ء کے بعد جب مغربی ادب کے اثرات ہندوستانی زبانوں کے ادب پر بھی ہونے لگے تو رومانیت کے تصورات سے ہمارے شعراء بھی نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ان تصورات کو اپنی تحقیقات میں پیش کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر محمد حسین نے اپنی تصنیف ''اردو ادب میں رومانی تحریک'' میں ایک جگہ لکھا ہے۔ رومانیت دنیا کو رنگینیوں کی عینک سے دیکھنے کی عادی ہے۔ وہ زندگی کی دشواریوں سے برسرِ پیکار

ہونے اورانھیں زیر کرنے کی زحمت برداشت نہیں کرسکتی کیوں کہ وہ معمولی سے بغاوت کر کے غیرمعمولی روش اختیار کرتی ہیں اور پھرانھوں نے اس کے تین خاص مفہوم بیان کیے ہیں:

1۔ عشق ومحبت سے متعلق تمام چیزوں کورومانی کہاجائے گا۔
2۔ غیرمعمولی آراستگی ، شان وشوکت وآرائش، فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کورومانی کہنے لگے۔
3۔ عہدوسطی سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پسندی کورومانی کالقب دیا گیا۔ (اردوادب میں رومانی تحریک از ڈاکٹر محمد حسین،ص۔11,12)

اردوادب میں رومانیت کے پروان چڑھنے کے زمانے سے ہی دو بنیادی میلانات پائے جاتے ہیں۔ایک مجہول رومانیت دوم متحرک رومانیت۔مجہول قسم کی رومانیت وہ ہے جوحقیقت پر رنگ چڑھا کرلوگوں کواس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پرآمادہ کرتی ہے۔یالوگوں کوحقیقت سے دور لے جاتی ہےاورانھیں داخلی دنیا کے بے معنی اور بے مصرف گورکھ دھندوں میں پھنسا کرسُلا دینا چاہتی ہے۔دوسری فعال اور متحرک قسم کی رومانیت ہے جوانسان کوزندہ رہنے، نیک اور پرسکون ماحول کی تعمیر کے لیے تقویت بخشتی ہےاورفردکودنیا اوراس کے مسائل کے خلاف بغاوت پرآمادہ کرتی ہے۔رومانی شاعراپنی رنگین طبع اور روح پرور ماحول کی مدد سے ایک ایسی حقیقت کوابدی شکل دے دیتا ہے جواس کے مزاج اوراس کے وقت اور زمانے ہی تک محدود ہوتا ہے۔اس کے کلام میں لذت وانبساط کاعنصر پایاجاتا ہے۔

پرسیٹلی کا خیال ہے کہ حسن کاری یعنی آرٹ کوزندہ رکھنے کے لیے تھوڑی سی افیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سے مراداس کے پاس آرٹ میں حسن وخوبصورتی کا پیدا کرنا ہےاوروہ اسی حسن وخوبصورتی کوکسی بھی تخلیق کی ایک طویل زندگی کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔اس کے بغیراس کے پاس ادب کی ابدی قدریں روکھی پھیکی نظرآتی ہیں۔رومانی پسند شاعر کیف وسرور میں ڈوبا رہتا ہے۔اس کے کلام میں رعنائی، رنگینی، سحرانگیزی، سحرآفرینی اورسرورمستی پائی جاتی ہے۔

شایداسی لیے یہ خیال عام ہوگیا تھا کہ رومانی شاعروں کی دنیا خواب وتصور کی دنیا ہوتی ہے۔ وہ تصوری اور خیالی محبوباؤں کے حسن سے محظوظ ہوتے۔ان سے باتیں کرتے اوران کے حسن کی

تصویریں اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔ بات خیالی محبوباؤں کی نہیں بات عورت کے حسن کی ہے کیوں کہ کائنات کے حسن میں اسی سے رنگ اور دل آویزی موجود ہے۔ اس لحاظ سے رومانی شاعروں کی پیش کی گئی تصویروں میں تخیل کی ملمع کاری بے صداقت نہیں ہوتی۔

رومانی شاعری ابدی قدروں سے گریز نہیں کرتی۔ سچائی اور نیکی سے بغاوت اس کے نزدیک جائز نہیں وہ پرانی اور فرسودہ روایتوں کو روا نہیں رکھتی۔ اس میں گہری فکر کے ساتھ ندرتِ خیال کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہ تقلیدی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی شان رکھتی ہے جس میں آفاقی افکار ورجحانات کی پذیرائی کے ساتھ ساتھ فکر وخیال کی رنگینی پائی جاتی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو رومانی شاعری کو قدیم عشقیہ شاعری سے الگ کرتی ہے۔ اگرچہ رومانی شاعری عشق و عاشقی کے خیالات سے خالی نہیں ہوتی۔ رومانی شاعری میں رومانیت کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اس کی ایک تاریخی مثال یہ ہے کہ فرانس روسو کے Back to Nature فلسفے کا اثر رومانی تحریک پڑا۔ اس سے وہاں کی سیاست بھی متاثر ہوئی جس کے نتیجے میں زبردست سیاسی انقلاب 1879ء میں آیا اس بنیاد پر ٹی۔ اے۔ ہیومے نے اس کو سیاسی تحریک سے وابستہ کیا ہے لکھتے ہیں:

> ''میں یہاں سیاست کا ذکر کرنے کے سلسلہ میں کوئی معذرت پیش نہیں کروں گا۔ رومانیت انگلینڈ اور فرانس دونوں جگہ بعض سیاسی نظریات سے وابستہ ہے۔''
>
> (ماخوذ، جدید اردو تنقید اصول ونظریات از ڈاکٹر شارب ردولوی، ص۔171)

رومانی شاعری حصول ومسرت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ رومانی شاعر اظہار خیال میں نفاست اور خوش طبعی عناصر سے کام لیتا ہے ہزاروں خوبصورت بُت تراشتا اور انھیں اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی دنیا میں محفوظ کر لیتا ہے۔ وہ حسن کے جلوؤں کا شیدائی ہوتا ہے۔ وہ عورت اور اس کے حسن کو حسنِ مطلق کی کرشمہ سازی تصور کرتا ہے۔ یہ کہنا ہے کہ رومانی ادیبوں اور شاعروں کے اعصاب پر عورت سوار ہوتی ہے حقائق سے ناواقف ہونے کو واضح کرتا ہے۔ رومانی شعراء وادباء کو عشق نکمہ نہیں بنادیتا بلکہ وہ عشق کی سحر کاری کے ذریعے شعر وادب میں شوخی ورنگینی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ جنسی آسودگی کے متلاشی نہیں ہوتے بلکہ نفسیاتی طور پر حسن سے تسکین اور سرور وانبساط حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں جو محرومی اور غم کی ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے۔ وہ جذبات میں گہرائی اور شدت پیدا کرنے کا وسیلہ سمجھی گئی ہے۔

بروک (Brooke) نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا جذبات حسن سے زیادہ اہم نہیں ہیں؟ اس کا جواب یہ تھا کہ حسن ظاہر ہی سب کچھ نہیں جذبات میں بھی حسن موجود ہوتا ہے۔ یہی وہ راز ہے جس رومانوی شعراء وادیب ہر جا حُسن کے متلاشی ہوتے ہیں۔ پھول کی پتیوں میں، کلیوں میں، شبنم کے قطروں میں، چاند تاروں میں، جسم کے اعضاء کی حرکات میں سیرت و کردار میں، وہ محبوب کی بے رُخی، جفاکشی اور بالا دستی کا گلہ نہیں کرتے۔ ان کے یہاں جو تڑپ ہوتی ہے وہ روح کو گرمانے اور قلب کو تڑپانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دیدارِ حسن سے حاصل ہونے والی لذت سرور و مستی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ وہ قیس وفرہاد کے مریضانہ عشق کو پسند نہیں کرتے جو ناکامی پر مایوسی، انفعالیت اور قنوطیت کا راستہ دکھاتا ہے۔ رومانی شعراء کے یہاں شبنم کی پاکیزگی بھی ہے اور دریا کی روانی بھی جس سے وہ نظر آفرینی کے ساتھ حیات آفرینی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کا غم قاری کو سُلاتا نہیں اور نہ ہی بہکاتا ہے بلکہ دل کو جگاتا اور آرزو کو ہر نفسِ حیات کے ساتھ اُبھارتا ہے۔ جذبات واحساسات میں وسعت اور توانائی پیدا کرتا ہے۔

رومانوی ادب نوجوانوں کو متاثر کرنے والا ادب سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس سے صرف نوجوان ہی متاثر ہوں بلکہ اس ادب سے ہر وہ شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جس کے جذبات کو حسن و عشق سے گہری نسبت ہے۔ حسن و عشق کے جذبہ کو جوانی تک ہی محدود کر دینا بوا لہوسی کی نشاندہی کرتا ہے۔

حسن سے متاثر ہونے کا جذبہ اور حسن کو چاہنے کا جذبہ ایک پاک اور خوبصورت جذبہ ہے جو وقت اور لمحات کی قیود سے آزاد ہے۔ اگر اس میں ہوس کا دخل ہو تو پھر اس کے لمحاتی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے کہ رومانی شعراء کی حِس عمر کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی جاتی ہے پھیکی یا ماند نہیں پڑتی۔ وہ حسن کی حدوں سے نکل کر کائنات وحیات کی وسعتوں میں گم ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رومانوی ادب ہو کہ شاعری خلوص، محبت، ایثار، دردمندی اور انسانی عظمت کے احساس کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ان میں زندگی ہنستی، گنگناتی، گاتی، مسکراتی، حقائق سے آگہی بخشتی گذرتی ہے اور رومانوی نظریات مسرت وانبساط کے ساتھ فرط و جوشِ عمل اور خوب سے خوب تر

کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

رومانیت کے جن عناصر کا ذکر کیا جاچکا ہے ان کو آسانی کے ساتھ اردو شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں بھی تلاشِ حسن، مسرت، عورت کی جستجو ان کی بڑھتی ہوئی تصوریت، غم، جوشِ عمل اور عظمتِ آدم کے تصورات پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اردو کے رومانوی ادیبوں میں ابو الکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، مہدی افادی، سجاد انصاری، قاضی عبد الغفار، اختر شیرانی اور عبد الرحمٰن بجنوری کے نام سب سے زیادہ اہم ہیں۔

چوں کہ راقم کا موضوع رومانی شاعر سے تعلق رکھتا ہے۔اس لیے ذیل میں چند اہم رومانی شعراء کے کلام کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے تا کہ جس شاعر کے کلام میں رومانی عناصر کا مطالعہ آئندہ باب میں آئے گا اس سے پیشتر اردو کے چند رومانی شعراء کی فکر وفن سے آگہی ضروری سمجھی گئی تا کہ یسیر کے کلام میں پائی جانے والی رومانیت کو سمجھنے اور شناخت کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش باقی نہ رہے۔ اردو رومانوی شعراء میں جن کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان میں حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، عزیز لکھنوی، فراق گورکھپوری، عرش ملسیانی، حسرت اور جگر مرادآبادی کے نام اہم ہیں۔ذیل میں مذکورہ شعراء کی رومانوی فکر پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔

●●●

اردو ادب کے چند منتخب رومانی شعراء کا سرسری جائزہ

حفیظ جالندھری:

حفیظ اردو کے رومانی شعراء میں اپنے انفرادی طرز کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا شعری کارنامہ ''شاہنامہ اسلام'' ہے لیکن ان کی دوسری نظموں میں قوم، وطن اور انسانیت کی محبت کا سچا درد ملتا ہے۔ ان کے یہاں جذبے کی تڑپ، الفاظ اور بیاں میں موسیقیت کا جادو موجود ہے۔

ان کی نظمیں لطیف سرشاری کے تاثرات میں ڈوب کر ابھرتی ہیں اور ایک محویت کا سماں باندھ دیتی ہیں۔ ان کی رومانی فکر کا یہ کمال ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ میں گھر کر لیتے ہیں۔ قاری ان کا ہم خیال ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے گیتوں میں بڑا رس اور من موہ لینے والی کیفیت موجود ہے۔ حفیظ کی زبان نہایت میٹھی نرم اور پُر اثر ہے۔ ان کی غزلیں ان کی رومانی فکر کی بہترین مثال ہیں جن میں ایک درد بھری تڑپ اور سادہ بیانی کی شان ملتی ہے جو رومانی طرز کا خاصہ رہا ہے۔

حفیظ کی رومانیت کا عمدہ ترین اظہار ان کی غنایت میں ہوا ہے۔ انھوں نے بحروں کے انتخاب اور الفاظ کی ترتیب سے آہنگِ نغمہ پیدا کیا۔ ان کی رومانیت کا ایک زاویہ ارضِ وطن کی محبت میں ظاہر ہوا ہے۔ حفیظ جالندھری کی رومانیت ارضِ وطن کے بارے میں پطرس بخاری لکھتے ہیں:

''حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس کی جھلک پر فدا ہے۔''

(بحوالہ اردو ادب کی تحریکیں، ص۔416)

حسن نے عشق پہ حیرت کی نگاہیں ڈالیں
خود تماشا ہوئے ہم محوِ تماشا ہو کر

....

آنکھ کمبخت سے اس بزم میں آنسو نہ رُکا
ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

اختؔر شیرانی:

اختؔر شیرانی رومانی شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ان کے دل آویز نغمے موجِ لطافت بن کر ابھرے اور کیف وسرشاری پیدا کرتے گئے۔رومانی شاعر ہونے کے ناطے اختر نے اپنے خیال کی دنیا میں ایک جنت تعمیر کرلی تھی جہاں دوشیزگی کا نکھار جادو جگاتا ہے۔ان کے کلام میں سرشاری اور سپردگی کا احساس موجود ہے۔

ان کا حسین تخیل لطیف غنائی کے پیکر تراشتا ہے۔نظموں اور غزلوں کے علاوہ اختؔر نے گیت بھی لکھے ہیں۔

اختر شیرانی نے اپنے اسلوب میں حسن ورومان اور بے کراں محبت کو اہم مقام عطا کیا ہے۔مقصدیت کی سنجیدگی سے انھیں کوئی غرض نہیں۔ان کے اسلوب میں عشق کو محوری حیثیت حاصل ہے۔اپنے موثر محاکاتی اسلوب اور دلکش تخلیقی فعالیت کو روبہ عمل لاکر وہ عشق ومحبت کے جذبات کو لطیف انداز میں پیش کرتے ہیں:

عشق و آزدی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے

....

عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

حسینائیں جو مثالی اور خیالی ہیں ان کے حسن کی دل کشی کا احوال بیان کرتے وقت اختر شیرانی قاری کو جذب ومستی کی دنیا میں پہنچادیتے ہیں۔ان تمام مہ جبینوں کا حسن اپنی پوری جلوہ سامانیوں، پُر بہار اثر آفرینیوں اور دلنواز مسکراہٹوں کے ساتھ نہاں خانہ دل پر دستک دیتا ہے۔اختر شیرانی نے اپنے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

کبھی سلمٰی کے رومان حسین کے تذکرے کیجیے
کبھی عذرا کے افسانے کو عشق رائیگاں لکھیے

کبھی پروین کی مرگ عاشقی پر فاتحہ پڑھیے
کبھی شمسہ کے زہر آلود ہونٹوں کا بیاں لکھیے

جوش ملیح آبادی:

ترقی پسند شاعروں میں جوش کو ''شاعر انقلاب'' کہنا بقول علی سردار جعفری غلط بات ہے۔ ان کے خیال میں جوش سوفی صد رومانی شاعر ہیں اور ان کے انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے۔ جوش کی رومانیت جو وطن کی محبت اور آزادی کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے۔ صحت منداور انقلابی عناصر کی حامل ہے۔ وہ سماج کے ظلم، فریب، ریا کاری کا پردہ چاک کرتی ہے اور عدل و انصاف اور محبت کی ترغیب دیتی ہے اور انسان دوستی کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں شاعر کہتا ہے:

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

جوش وڈزورتھ کی طرح سحر کے جلوؤں سے خدا کے وجود کا ثبوت حاصل کرتے ہیں۔ ان کی شاعری جذبات واحساسات کی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی مفکر یا فلسفی نہ بن سکے بنیادی طور پر وہ رومانی نغموں کے شاعر ہی سمجھے گئے۔

جوش ملیح آبادی کی شاعری کے جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں نقش ونگار، سرود وخروش، شعلہ وشبنم، فکر ونشاط، حرف وحکایت، جنون وحکمت، سیف وسبو، آیات ونغمات، جوش وخروش اور روح ادب شامل ہیں۔ ان کی سوانح عمری ''یادوں کی بارات'' ان کے اسلوب کی مظہر ہے۔ جوش کی نظم ''تصویرِ جمال'' سے ایک اقتباس درپیش ہے۔ اس نظم میں جوش نے لفظی مرقع نگاری سے جو سماں باندھا ہے وہ بے حد مسحور کُن ہے۔ جوش کی رومانی شاعری کی یہ ایک عمدہ مثال ہے:

لہراتی تھیں زلفیں کھل کھل کر اس شان سے رنگیں شانوں پر
جس طرح گھٹائیں ساون کی جھک پڑتی ہیں مے خانوں پر

....

ہونٹوں پر دھیمے نغمے تھے یا محو تھیں حوریں قرات میں
مکھڑے پر لٹوں کا پرتو تھا یا آب حیواں ظلمت میں

....

چلتی تو قدم یوں رکھتی تھی دن جیسے کسی کے پھرتے ہیں
یا ناز سے بھیگی راتوں میں شبنم کے قطرے گرتے ہیں

ﷺ

عزیزؔ لکھنوی :

عزیزؔ لکھنوی سے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ ان کی غزل کی بنیاد غالبؔ کے نئے تغزل پر رکھی گئی ہے۔عزیز نے لکھنوی ماحول میں رہ کر بھی رومانی فکر سے سمجھوتہ کیا۔ وہ شعوری طور پر غالب کو پسند کرتے تھے۔ باوجود اس کے رومانوی اندازِ فکر سے زیادہ قریب تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں موثر جذبات نگاری اور سادہ بیانی کے عناصر پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کی کئی نظمیں اور غزلیں رومانی ہیں۔
فرماتے ہیں:

امتحان گاہِ محبت نہیں گلزارِ خلیل
کون ایسا ہے جو زخموں سے یہاں چور نہیں
(مجموعہ کلام انجم کدہ)

تہہ میں دریائے محبت کے تھی کیا چیز عزیزؔ
جو کوئی ڈوب گیا ، اس کو اُبھرنے نہ دیا

....

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑا ئی. کا

ﷺ

فراقؔ گورکھپوری:

اردو شاعروں میں فراقؔ گورکھپوری کئی حیثیتوں سے مشہور و مقبول ہیں۔ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے ان کی شاعری ندرتوں اور جذبوں کو جگانے والی شان رکھتی ہے۔ان کا ذہن حسین مینا کاری کے ساتھ جذبوں کو شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ان کے کلام میں گہرائی، رس اور ترنم کی لطیف جھنکار نمایاں ہے۔ یہ جھنکار گھن گرج والی جھنکار نہیں بلکہ موسیقیت اور حسن کا جادو جگاتی ہے۔ان کا کلام سادگی، خلوص اور جذباتی آہنگ کی بہترین مثال ہے فرماتے ہیں: ؎

تم مخاطب ہو سامنے بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

....

پیکر تراشنے میں فراقؔ کو بے پناہ قدرت حاصل ہے:

یہ تن نازنیں کی انگڑائی
یہ کہکشاں نے کمان لچکائی

....

فراقؔ رومانی شاعر ہونے کا سبب ایک نئی دنیا کے نقیب ہیں۔

عرشؔ ملسیانی:

عرشؔ ملسیانی کا تعلق ان شعراء سے ہے جو پرانی قدروں سے برگشتہ نظر آتے ہیں اور ان کی جگہ نئی زندگی کے تقاضوں کے مطابق نئی قدروں کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی مذہب سے بیزار اور رسوم و روایات کی بندشوں سے آزاد ہو کر کھلی فضاء میں جینا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ؎

پائے عالم میں ہے زنجیر قدامت اب تک
گردنِ دہر میں ہے طوقِ روایات ابھی

....

یہ ہے اک واقعی تفصیل میری آپ بیتی کی
بیانِ دردِ دل کو اِک کہانی کون کہتا ہے

....

کسی نغمے میں ہے وہ اور نہ کسی ساز میں ہے
اس بھری نرم سی لے جو تیری آواز میں ہے

حسرتؔ موہانی:

اردو غزل کو نئی زندگی دینے والوں میں حسرتؔ موہانی کا نام سرِ فہرست ہے وہ سادگی اور درویشانہ مشرقیت کا نمونہ تھے لیکن خیالات ونظریات میں انتہا درجے کے انتہا پسند تھے۔ وہ تسلیم کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام میں برجستگی اور خلوص کا جذبہ نمایاں ہے۔ جذبات وارداتِ قلب اور بے ساختگی کی روایت اردو غزل میں حسرتؔ ہی سے عام ہوئی۔ اس لحاظ سے وہ اردو کی رومانوی شاعری میں جری اور بے باک شاعر سمجھے گئے۔

حسرت موہانی نے اپنے سیاسی اور عملی زندگی سامراج دشمنی اور بغاوت کو اپنا شعار بنایا۔ ان کی شاعری میں ارضیت اور جسمانیت کے باوجود پاکیزگی اور لطافت کا احساس پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو انحطاطی مکتب سے آزاد کیا اور اس کی ترقی کی نئی جہتیں متعین کیں۔

ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

خرد کا نام جنوں پڑگیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

....

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

....

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ اُنگلی دبانا یاد ہے

....

دل کو جس دن سے ہوئی تیری محبت کی ہوس
ہم کو دوزخ کا ہو کچھ خوف نہ جنت کی ہوس

....

نہیں آتی ،تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

جگر مرادآبادی:

جگر اردو کے ایک بہترین رومانی شاعر ہیں۔ان کے پاس عشق کی وارفتگی اور رنگینی بیان کی دلکشی پائی جاتی ہے۔جگر حسن ظاہری کے طرفدار ہیں۔وہ جذبات کے اندر چھپے ہوئے حسن کے متلاشی ہیں۔فرماتے ہیں ؎

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

....

جگر کائنات کے ہر ذرّہ میں حسن کو تلاش کرتے ہیں فوراً اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ کسی ایک ہی جگہ حسن دیکھ کر محو ہو جانا اور نظریں صرف اسی پر مرکوز کر لینا مناسب نہیں اس لیے کہ: ؎

شش جہتِ آئینہ حسن حقیقت ہے جگر
قیس دیوانہ تھا محو روئے لیلیٰ ہوگیا

....

جگر کا تصورِ حسن بوالہواسی اور غلاظت نہیں وہ حسن وعشق کے رجائی رجحان کے خالق ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی حسن کے بغیر بے معنی ہے۔یہی وہ نکتہ ہے کہ جگر مبتلائے عشق بھی ہے اور محوِ حسن بھی فرماتے ہیں: ؎

نغمہ ترا نفس نفس جلوہ ترا نظر نظر
اے مرے شاہدِ حیات اور بھی قریب ترا

....

ہرلحظہ شانِ حسن بدلتی رہی جگؔر
ہر آن ہم جہانِ دیگر دیکھتے رہے

....

آخری وقت تک جگؔر کی یہ رومانی حس ماند نہیں پڑ سکی۔ ان کی غزلیں رنگینی و سرمستی شادابی و شگفتگی کی بہترین مثالیں ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو شاعری میں جس جدید رومانی تحریک کا آغاز اخترؔ شیرانی اور جوشؔ کی شاعری سے ہوتا ہے۔ اس نے مجازؔ، فراقؔ، حفیظؔ، اخترؔ انصاری اور سکندر علی وجدؔ ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ کیفیؔ اعظمی، ساحرؔ لدھیانوی، ظہیرؔ کاشمیری، مخدومؔ محی الدین، احمد ندیم قاسمؔی، جاں نثار اخترؔ اور فیض احمد فیضؔ کو بھی بے انتہا متاثر کیا جس کا اعتراف سردار جعفری نے بھی کیا ہے:

> ''پہلی جنگِ عظیم کے بعد اختر شیرانی نے عورت کو معشوقہ اور محبوبہ بنا کر پیش کیا ہے اور اردو شاعری میں ہمیشہ کے لیے اس کی جگہ بنالی۔ یہ کام انھوں نے اس وقت کیا جب اقبالؔ اور جوشؔ بھی اپنی شاعری میں معشوقہ کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ترقی پسند شاعروں نے اخترؔ شیرانی کی اس روایت کو آگے بڑھا کر اردو شاعری کو زیادہ فطری بنادیا۔''

●●●

یسیر کرنولی کے حالاتِ زندگی

فراق گورکھپوری اپنی ایک تصنیف میں اس طرح رقم طراز ہیں کہ شائد کچھ زمانے کے بعد کوئی ایسا غزل گو شاعر پیدا ہو جسے ہم میرؔ، وغالبؔ کا ہم مرتبہ سمجھ سکیں۔ کرنول کی سرزمین کو اعجاز حاصل ہے کہ اس نے وجہہ الدین وجدی، شاہ فی الحال اور ڈاکٹر عبد اللطیف جیسے بلند پایہ شاعر اور ادیب پیدا کیے ہیں تو وہیں اس کی خاک سے ایک ایسا غزل گو بھی پیدا ہوا جسے میر و غالب کا ہم مرتبہ سمجھا جاسکتا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید دکن کے (حیدرآباد) مشہور و معروف شاعر جناب اوج یعقوبی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

وہ جناب امیر علی خان یسیرؔ کا تعارف لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شرافت وانکساری، سادگی ومحبت کے اس پیکر کو دیکھ کر پہلے پہل یہ ماننے ہی کو تیار نہ ہوا کہ واقعی یہ صاحب کوئی شاعر ہوں گے لیکن جب اس مشاعرے میں غالبؔ کی ایک سنگلاخ زمین میں یسیرؔ صاحب نے غزل سنائی تو خود میری ہمہ گوئی اور ہمہ دانی کا احساس متزلزل ہو کر رہ گیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کرنول جیسے دُور افتاد مقام میں ایسا شاعر بھی ہوگا۔ میں اگر زیادہ صاف گوئی سے کام لوں تو بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہوں کہ رفع شک کے طور پر میں نے ان سے کچھ سنانے کی خواہش کی چناں چہ یسیرؔ صاحب نے غالبؔ ہی کی زمینوں میں مزید دو غزلیں سنائیں، نتیجتاً مجھے کہنا پڑا کہ علامہ یسیرؔ کو غالبِ دکن کا خطاب دیا جانا چاہیے۔ غالباً یہ بات میرے دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی جس میں بھرپور خلوص تھا کہ آج سارا آندھرا پردیش آپ کو غالبِ دکن ہی کے نام سے جانتا ہے۔'' (نفیر شوق، تعارف، ص۔4,5)

پروفیسر رضی الدین احمد، صدر شعبہ عربی، فارسی اور اردو، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی نے نفیر شوق کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''میرے نزدیک تقلیدِ غالب کی راہ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے البتہ اگر فنکار اس راہ کی مشکلات پر قابو پالے تو وہ فاتحانہ اپنی قوت شاعری کا لوہا منوالیتا ہے گولوہے کی قیمت کے لیے اس کا جولہو صرف یا سوخت کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہیں زیادہ گراں، گہرا اور گمبھیر ہوتا ہے۔ نفیر شوق میں غالبؔ کی زمین میں ایسے شعر مل جاتے ہیں جن کی داد نہ صرف عام قاری دیتا ہے بلکہ اگر غالبؔ ان کو سن پاتے تو وہ بھی داد دیئے بغیر نہ رہتے۔''

(نفیر شوق، پیش لفظ، ڈاکٹر رضی الدین، ص۔24)

غالبِ دکن کے خطاب سے پہچانے جانے والی شخصیت کا نام امیر علی خان اور یسیرؔ تخلص تھا۔ 1906ء کو شہر کرنول میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام علی خان سموزی تھا وہ پٹھان تھے اور سموزی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ سموزی، مندوزی جیسے فرقے عموماً فوجی پیشہ ہوا کرتے تھے۔

کرنول کے نوابوں نے ان فرقوں کے پٹھانوں کو فوج میں رسالدار جیسے بڑے عہدوں پر فائز کیا تھا۔ جاگیریں عطا کی تھیں۔ کرنول کے رسالدار پٹھانوں سے امیر علی خان یسیرؔ کی قریبی رشتہ داری تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یسیرؔ کو بھی ان ہی جاگیروں کا کچھ حصہ وراثت میں ملا تھا جس کی وجہ سے ان کو عمر بھر کسی پیشہ کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر گورنمنٹ محمڈن ہائی اسکول (جو آج گورنمنٹ ہائی اسکول برائے اردو طلباء کہلاتا ہے) میں شریک کر دیئے گئے۔ یہاں سے آپ نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ اس زمانہ میں اعلیٰ تعلم کے وسائل کرنول میں محدود تھے جس کی وجہ اوسط یا غریب خاندانوں کے لڑکے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے تھے۔ یسیرؔ کا تعلق اعلیٰ متوسط طبقہ سے تھا باوجود اس کے یسیرؔ نے سررشتہ تعلیم کے دفتر میں بحیثیت کلرک ملازمت حاصل کرلی۔ حصول علم کا شوق فطری تھا اس لیے خانگی طور پر مدراس یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات اعلیٰ نشانات کے ساتھ کامیاب کیے۔ کسی آزادہ پیشہ کو اختیار کرنے کے خیال نے انھیں بی۔ایل

کرنے پر مجبور کیا۔

انہوں نے وکالت کی یہ سند 1940ء میں حاصل کی جس کے لیے مدراس کالج میں دو سال زیرِ تعلیم رہے۔ جولائی 1947ء میں ملازمت سے مستعفی ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ صدیق قیسی قمرنگری نے اپنے مقالہ ''کرنول کا اردو ادب آزدی سے پہلے'' میں یسیر کے بیان کو نقل کیا ہے کہ انھیں جولائی 1947ء میں اس بات کا احساس بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ اب عنقریب ملک آزاد ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ وجہ بتائی کہ ''میں دوقومی نظریہ کا حامل تھا اور ہوں۔ لہٰذا بھارت سرکار کی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ چوں کہ جولائی 1947ء میں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ ملک آزاد ہو جائے گا۔ میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ جب وکالت شروع کی اور ایک مقدمے میں کامیابی بھی ملی لیکن اس کامیابی کے ملنے کی خوشی اسی وقت ختم ہو گئی جب انھیں پتہ چلا کہ انھوں نے جس کا مقدمہ لڑا اور کامیابی دلائی وہ جھوٹا تھا۔ یسیر کو جھوٹ اور جھوٹے مقدمات سے نفرت تھی۔ چناں چہ انھوں نے اس پیشہ کو صرف اس لیے خیر باد کہہ دیا کہ وکالت کے لیے جھوٹ بولنا لازم و ملزوم ہے۔

ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد پیشے کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس سے جو بیکاری پیدا ہوئی تھی وہ کوئی ایسا دماغی مشغلہ چاہتی تھی جس کو اختیار کرنے اور بندھے رہنے میں کوئی قباحت نہ رہے۔ چناں چہ شاعری کو اپنانے کا ارادہ کیا۔ گذر بسر کے لیے جو زمین و جائیداد آبا و اجداد سے ملی تھی اس کی آمدنی اتنی تھی کہ یسیر کا گذارا نہایت ٹھاٹ کے ساتھ ہو سکتا تھا۔

صدیق قیسی قمرنگری نے امیر علی خان یسیر کے آبا و اجداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''آپ کے آبا و اجداد کا تعلق حکومتِ نظام کے رضا کاروں سے تھا۔ وہاں سے وہ لوگ ہیرے جواہرات اور دولت لے کر کرنول آ گئے تھے علاقہ یتیم چرلہ میں اراضی خرید کر خیمہ لگوائے۔ اس علاقے میں لوہے سے بنے چالیس گڑھے 1984ء تک موجود تھے۔ جن میں بقول یسیر ہیرے جواہرات بھرے گئے تھے۔ یسیر نے ان گڑھوں کا لوہا فی گڑھا بیس ہزار روپیے میں فروخت کیا۔ یسیر کہتے ہیں کہ ان کے اجداد نے عیش و عشرت کی زندگی گذاری۔ روزانہ لکھنو جیسے دور دراز علاقے سے طوائفیں یتیم چرلا آیا کرتی تھیں۔ ان تمام باتوں کے

باوجود یسیرؔ کے حصہ میں بہت سی دولت آئی اور انھوں نے تاحیات کسبِ معاش سے آزاد زندگی گذاردی۔'' (کرنول کا اردو ادب آزادی سے پہلے، ص 285)

مندرجہ بالا بیان کا جائزہ لیا جائے تو بہت ساری باتوں کے ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ رضا کار ایک ایسی عام رعایا کی جماعت ہے جو بادشاہ عثمان علی خاں آصف سابع کی محبت میں حکومت کو بچانے کے لیے بلا کسی معاوضے کے تیار ہوگئی تھی۔ اگر یسیرؔ کے آبا و اجداد کا تعلق حیدر آباد کے رضا کاروں سے ہے تو یہ جماعت آزادی سے ذرا پہلے نمودار ہونے والی جماعت ہے۔ یسیرؔ کے آبا و اجداد بیسویں صدی کے اوائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مال و دولت ہیرے جواہرات کی اس کثیر مقدار میں ییتم چرلا جیسے مقام پر منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ اس زمانے میں عالم پور تک عثمان علی خاں کی حکومت تھی اور کرنول کی سرحد پر مدراس ریسیڈنسی کے کارندے سخت تنقیح (Checking) کے بعد آنے یا جانے دیتے تھے۔ ایسے میں اتنی دولت کا وہاں سے لے آنا ممکن ہی نہ تھا جب کہ ایک لوہے کا خالی گھڑا بیس ہزار کی قیمت والا اس کی ہئیت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ اتنے بڑے گھڑے کا چوری سے علاقۂ تلنگانہ سے صوبہ مدراس کے علاقے ییتم چرلا میں منتقل کر دینا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

یہاں ایک اور بات واضح کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ یسیرؔ کے آبا و اجداد عیش و نشاط کی محفلیں سجایا کرتے تھے اور ان کے لیے طوائفیں لکھنؤ سے روز آیا کرتی تھیں۔ اس دور میں نقل و حرکت کے ایسے کونسے ذرائع تھے کہ لکھنؤ سے ییتم چرلا ہر روز آنا جانا ممکن ہوسکتا۔ اس لیے اوپر کے بیان سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ یسیرؔ نے ایسا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ یہ کسی گپ بازی کی اڑائی ہوئی افواہ ہے جس کو کہنے والے نے صدیق قیسی قمر نگری سے یسیرؔ کا حوالہ دے کر کہہ دیا ہو اور صدیق قیسیؔ نے اس بات کو بلا تحقیق اپنے مقالے میں شامل کرلیا ہے۔ اگر ایسا رئیسانہ معاملہ ہوتا تو یسیر نے آخری دم تک جس گھر میں زندگی گذاری وہ کم از کم پختہ اور تمام ضروریات کی تکمیل کا حامل ہوتا۔ ڈاکٹر وحید کوثر اور دیگر ان کے قریبی شاگردوں سے راقم نے سنا ہے کہ ان کا مکان انتہائی خستہ حالت میں تھا۔ وہ جس کمرے میں رہا کرتے تھے، بارش کے ایام میں اس کی چھت ٹپکتی تھی۔ یسیرؔ نے بھی ابتدائی کلام کے تلف ہوجانے کی وجہ یہی بتائی ہے۔ لکھتے ہیں:

"1943ء کے موسم گرما کی ایک غیر متوقع شدید بارش میں میرا کلام چکش (ٹپکے) کی نذر ہو گیا اور اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب کے سارے کاغذات سوکھ کر متجھر ہو چکے تھے۔ کلام کے اس طرح تلف ہو جانے کا صدمہ شدید رہا کہ میں نے فکرِ سخن ہی کو خیر آباد کہہ دیا۔ اس طرح میری شاعری کا پہلا دور ایک حزنیہ بن کر ختم ہو گیا۔" (نفیرِ شوق، شگفتی، ص۔35)

امیر علی خان یسیرؔ نے اپنی موورثی زمین پر زراعت بھی کی لیکن اس سے بھی کوئی بڑا فائدہ نہیں ہوا۔ بالآخر مجبور ہو کر زمین کسانوں کو گتے پر دی اس سے جو بھی محصول آتا تھا اسی پر عمر بھر قناعت کیے ہوئے تھے۔ انھیں اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ بہن کے بچوں نواسوں اور پوتوں کو ہی اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ بہن یونانی علاج سے واقف تھیں۔ یسیرؔ بھی طبِ یونانی میں مہارت رکھتے تھے۔ اکثر اپنا علاج آپ کیا کرتے تھے۔ انگریزی ادویات سے حتی المقدور پرہیز کرتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ یونانی ادویات دوا اور غذا دونوں خصوصیات رکھتیں ہیں۔ اس سے مریض کو نقصان کا خطرہ کم رہتا ہے۔ جلدی امراض، پھوڑوں اور متعدی بیماریوں کے علاج کے کئی نسخے ان کے پاس موجود تھے بلکہ یاد تھے۔ آپ کی بہن کے پاس کئی لوگ ان بیماریوں کا علاج کرواتے اور شفا پاتے تھے۔

حاکمانِ کرنول سے متعلق ان کی رائے نہایت ہی جچی تلی ہوتی تھی۔ اشیاء اور ادویات کی جانچ اور شناخت میں مہارت رکھتے تھے۔ ان سے ایک مرتبہ ان کے شاگردوں نے دریافت کیا کہ آپ کیوں خود کوئی مطب کھول نہیں لیتے۔ آپ کا مطلب کرنول کے حکماء سے زیادہ بہتر اور کامیاب رہے گا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ "اس پیشے میں خدمت کا جذبہ نہ ہو تو بیکار ہے۔ روپے کمانے کی نیت سے حکماء اکثر جھوٹ بولتے ہیں اور مرض کو طول دے کر مریض سے روپے حاصل کرتے ہیں، یہ مجھ سے ممکن نہیں۔" پھر ایک مرتبہ کسی سوال پر کہا تھا کہ "آج صحیح اشیاء دستیاب کہاں ہوتی ہیں کہ ادویات تیار کی جاسکیں۔ اہم شئے مہنگی اور کم یاب ہوتی ہے۔

جب مریض اس کی قیمت برداشت نہیں کر پاتے، تو دوا بے اثر ہو جاتی ہے۔ آج مطب چلانا نہایت ہی مشکل کام ہے۔" ان کو یونانی کمپنیوں میں تیار کردہ دواؤں پر یقین ہی نہیں تھا۔ خود

اشیاء خرید کر اپنے لیے دوا تیار کرلیا کرتے تھے۔ قریبی احباب اور عزیز شاگردوں کو جب کسی بیماری میں مبتلا دیکھتے تو پرہیز کا مشورہ دیتے۔ دوا کا نسخہ لکھ کر عنایت کرتے۔ ساتھ میں دوا تیار کرنے کا طریقہ بھی بتاتے تھے۔ اگر کوئی ان کے مشورہ پر عمل کرتا اور پابندی سے دوا استعمال کرتا تو صحت مند ہو جاتا تھا۔ پھر برسوں اس مرض کا شکار نہ ہوتا تھا۔ خود زندگی میں اصول پسند واقع ہوئے تھے۔ بے وقت کھانا، مقدار سے زیادہ کھالینا، جو ملے کھالینا انھیں پسند نہ تھا۔ ان کی صحت خود ان کی احتیاط اور اصول پسند ہونے کی چغلی کھاتی تھی۔

اوج یعقوبی نے ان کی صحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پون صدی عمر کی اس سال خوردہ شخصیت کی صحت اور قویٰ کو دیکھ کر ہم جیسے چھ دہائی والے بھی شرماتے تھے۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں ان کے حواس اور صحت کی سلامتی کا راز احتیاط پسندی میں پنہاں ہے۔"

(نفیرِ شوق، تعارف، اوج یعقوبی، ص۔5)

موصوف اپنی نجی زندگی میں انتہائی با کردار اور با اصول محتاط آدمی تھے۔ عام شعراء کی طرح نہ ان کے مزاج میں تکبر تھا نہ گفتگو میں انانیت کا اظہار ہوتا تھا وہ سادی، شرافت و انکساری کی منہ بولتی تصویر تھے۔ سگریٹ، چائے اور ناس کے عادی تھے لیکن ان سب کے استعمال کے بھی اوقات مقرر تھے۔ بے وقت کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ اپنے ملنے والے قریبی احباب جب سگریٹ یا چائے انھیں پیش کرتے تو وقت کا انتظار کرتے۔ جن احباب کو یہ بات معلوم تھی وہ انھیں کسی چیز کے پیش کرنے سے پہلے وقت کا لحاظ کیا کرتے تھے۔ ہر روز شام کا وقت نائیک پریس چوک کرنول میں گذارتے تھے۔

اس دور میں انگریزی اخبار "ہندو" (The Hindu) کا مطالعہ کرتے تھے۔ اخبار بینی کے دوران کسی سے بات نہ کرتے تھے۔ کوئی اہم مسئلہ ہو یا کوئی اہم شخص اس دوران ملنے آجائے تو تب ہی اخبار سے ہٹ کر اس شخص یا مسئلہ پر توجہ دیتے تھے۔ اکثر شام کے وقت نائیک پریس پر ان سے ملنے والے آتے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں۔ اگر کسی کو کوئی قانونی مشورہ لینا ہو تو اسی وقت ممکن تھا۔ ہر جو کوئی قانونی مشورہ لینے کے لیے آتا اسے انتہائی سود مند مشورہ دیا کرتے

تھے۔کرنول کے وکلاء ان کی قابلیت سے کافی متاثر تھے اور وقتاً فوقتاً ان سے قانونی مسائل پر گفتگو کے لیے آجایا کرتے تھے۔ان کی فکرِ رسا کا یہ عالم تھا کہ اخبار کی خبریں پڑھ کر آنے والی سیاسی تبدیلیوں کی پیشن گوئی کردیتے تھے جو نوے فیصد صحیح ثابت ہوتی تھی۔ان ساری باتوں کے باوجود سیاسی اُمور سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ برخلاف اس کے جب کسی مشاعرے کا ذکر ہوتا، علمی و ادبی گفتگو ہوتی۔کسی شاعر کے کرنول آنے کی خبر ملتی تو اس میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔

حیدرآباد یا کسی دوسرے علاقے سے جب کوئی شاعر یہاں ایک دو دن کے لیے آجاتا تو اپنی قائم کردہ بزمِ سخنستان میں اس کے اعزاز میں مشاعرہ رکھتے۔مشاعرے منعقد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک کاغذ پر مشاعرہ کی تاریخ، دن، وقت، مقام اور مصرعہ طرح یا غیر طرحی مشاعرہ کا ذکر ہوتا۔یہ کاغذ عبدالکریم صاحب رفیق الشعراء کے حوالے کردیا جاتا۔اس کو گشتی کہتے تھے۔وہ اس کاغذ پر جس شاعر یا مہمان شاعر سے ملتے اس کے دستخط لے لیتے۔ہر وہ شخص یا شاعر جو اس کاغذ پر دستخط کرتا تھا مشاعرے میں شریک رہتا تھا۔نئے شاعر یا مہمان شاعر کا تعارف کرایا جاتا۔گُل پوشی ہوتی۔پھر قرآتِ کلامِ پاک اور نعتِ شریف سے مشاعرے کا آغاز ہوتا۔کاشانۂ معذور میں مشاعرے کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا۔چائے، پان، سگریٹ شعراء اور سامعین کو پیش کیے جاتے تھے۔یسیر کے ہم عصر شعراء کے علاوہ ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد سے مشاعرہ میں رونق بڑھ جاتی تھی۔مشاعرہ رات کے ایک دو بجے اختتام پذیر ہوتا تھا۔مشاعرہ میں کلام سنانے کے بھی آداب تھے۔

ابتدا میں مبتدی شعراء کو موقعہ دیا جاتا تھا پھر مقام و مرتبے کے لحاظ سے شعراء کو کلام سنانے کی دعوت دی جاتی تھی۔مہمان شاعر کا نمبر حضرت یسیرؔ سے پہلے ہوتا تھا۔یسیرؔ جب سناتے تو مسلسل دو، دو، چار، غزلیں اپنے حافظے سے سنایا کرتے تھے۔طرحی غزل ہوتی تو ہی کاغذ پر لکھ کر لے آتے تھے۔باقی سارا کلام انھیں ازبر تھا گویا وہ اپنے کلام کے خود حافظ تھے۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنا سارا وقت شاعری کے لیے ہی دے رکھا تھا۔

اوج یعقوبی لکھتے ہیں:

''موروثی جائیداد کی فراوانی نے بھی انھیں ملازمت اور وکالت کے جھمیلوں سے بچایا۔اس طرح علامہ یسیرؔ ہمہ وقتی شاعر ہو گئے۔ایک محتاط انداز کے مطابق ان

کی شاعری کی عمر پچپن ۵۵ سال سے متجاوز ہو چکی ہے۔ دل کی جوانی اور دماغ کی توانائی کا یہ پورا زمانہ جس نے اردو غزل کی نذر کر دیا ہو تو اس کے کلام میں استقام اور اغلاط کا کیا سوال۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ شاعر کے کردار کا عکس عموماً اس کے شعر میں رقص فرما ہوتا ہے۔ چناں چہ علامہ یسیرؔ کے کلام کی شستگی و شائستگی علامہ یسیر کے دور کی خاص روایات میں شامل تھی لیکن یسیرؔ کی خوداعتمادی نے اس روایت سے کامیاب انحراف کیا۔ چناں چہ فنِ شاعری میں یہ کسی کے دست گرفتہ نہیں ہیں۔ ان کی نظر رہنما اور ان کا مزاج ہی ان کا مصلح بنا رہا۔''

(نفیر شوق، تعارف، اوج یعقوبی، ص۔ 4,5)

یسیر صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ باہر سے آنے والے شاعروں اور ادیبوں کی قدردانی کیا کرتے تھے۔ اس سے ان کی اردو دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیرونی شعراء کی عزت کرنا، ان کے اعزاز میں شعری محفلوں کا انعقاد کرنا ان کے لیے مسرت کی بات تھی۔ افسوس اس بات پر ہے کہ بیرونی شعراء نے انھیں بہت کم ہی اپنے علاقہ کے مشاعروں میں مدعو کیا۔ خود ان کے شہر کرنول کے افراد نے بھی ان کی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ یسیرؔ نے ساری باتوں کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کیا لیکن جب نفیر شوق کی اشاعت عمل میں آئی تو اپنی بات کہنے کے دوران وہ اس تکلیف کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔

فرماتے ہیں:

''کرنول ایک ایسا مقام ہے جہاں ہمیشہ ہر اہلِ فن کی بے قدری رہی ہے۔ مجھے اپنے ہم وطنوں سے کوئی شکایت نہیں کہ انھوں نے زبان و ادب کے لیے میری خاموش خدمات کا مجھے کوئی صلہ نہیں دیا۔ البتہ میں ادھونی کے اردو دوستوں کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے 1964ء میں مجھے بزم ولی ادھونی کی جانب سے تاج دارِ سخن کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ پھر بزمِ شعر و ادب اننت پور نے 1974ء میں بحیثیت شاعر رائلسیما میری گلپوشی کی اور شال سے نوازا۔ اس قدر افزائی کے لیے میں اننت پور کے ارباب اردو کا بے حد شکر گذار ہوں۔ شہر

حیدرآباد کے جتنے بھی اخباری دنیا میں شہرت پانے والے شعراء ہیں جن میں کچھ میری نظر میں فن داں ہیں اور کچھ فن سے عاری بھی۔ سب کے ساتھ ایک لمبے عرصے سے مشاعرے پڑھتا رہا ہوں لیکن حیدرآباد کے کبھی کسی مشاعرے میں بلایا نہ گیا۔ مجھے اس تعلق سے کوئی شکایت نہیں اس لیے کہ اس شہر کے اچھے اور نام نہاد بھی شاعر احساس برتری کا شکار ہیں۔ میں اس ناانصافی کا فیصلہ وقت کے امتداد پر چھوڑتا ہوں وہ خود فیصلہ کردے گا۔"

(نفیرِ شوق، گفتنی، علامہ امیر علی خان یسیرؔ، ص۔37,38)

علامہ یسیرؔ نے شعر و ادب کی جو خاموش خدمت انجام دی ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ قریب نصف صدی تک انھوں نے اپنے شہر کی شناخت علم و ادب کی دنیا میں بنائے رکھی۔ یہاں کے نوجوان شعراء کی تربیت جس انداز سے انھوں نے فرمائی وہ یقیناً ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ نوجوانوں کو شاعری سے قریب کرنا فنِ شعر سے آگہی بخشنا، شعر سنانے کے انداز سے واقف کرنا، غزلوں پر اصلاح دینا۔ تلفظ کی اور املا کی غلطیاں درست کرنا، یقیناً ایک صبر آزما کام ہے۔ یسیرؔ نے یہ سب کچھ بلا معاوضہ کیا جب کہ اس دور میں سیمابؔ اکبرآبادی جیسے کئی شعراء نے اصلاح شعر کے اسکول کھول رکھے تھے جس میں داخلہ فیس اور معاوضہ کے بغیر ممکن نہ تھا۔

وہ نومشق شاعر کی تخلیقات پر پوری توجہ دیتے تھے۔ اُبھرتے ہوئے نوجوان تلامذہ سے خوش ہوتے تھے۔ اساتذۂ سخن کے اشعار سناتے تھے اور اپنے ان اشعار سے بھی واقف کراتے تھے جو ان اساتذہ کی نہج پر لکھے گئے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد نوجوان شعراء میں شعر فہمی کو جلا دینا ہوتا تھا۔ یسیرؔ مشاعروں میں اپنی غزلیں تحت اللفظ پڑھتے تھے اور تحت اللفظ پڑھنے ہی کو مناسب سمجھتے تھے۔ اگرچہ تلامذہ کو تحت میں پڑھنے کی ہدایت نہیں کرتے تھے یوں بھی تحت میں پڑھنے سے غزل کی ساری نزاکتیں اور رعنائیاں خاص طور پر الفاظ کا تلفظ صحیح انداز میں یکے بعد دیگر سامنے آجاتا ہے۔

غالباً اسی خیال کے تحت وہ تحت میں پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ترنم کے وہ مخالف نہیں تھے۔ فنِ شعر کی وضاحت کے زیادہ قائل تھے۔ اگر کوئی شاگرد ترنم سے اپنی غزل سناتا ہے اور فن کی ساری

نزاکتوں کا خیال بھی رکھتا ہے تو وہ خوش ہوتے تھے۔ دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ یسیرؔ کے شاگردوں میں اکثر تحت میں پڑھنے والے ہی ملیں گے۔ یسیرؔ شاگردوں کے اچھے اشعار کو دہراتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ غزل سنانے کے دوران اگر کوئی شاگرد کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا کرتا تو وہ فوری اس کے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر کے شاگرد کو صحیح تلفظ کے دہرانے کی ترغیب دیتے تھے۔ یہاں ان کا مقصد ایک طرف شاگرد کی اصلاح کرنا ہو تو دوسری طرف دوسروں کی حرف گیری سے شاگرد کو بچانا بھی ہوتا تھا۔ یسیرؔ چوں کہ غزل کے شاعر تھے اور انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی غزل ہی کے لیے تیار کیا۔

اسلامیہ کالج وانمباڑی کے صدارتی خطبہ میں اس کا واضح طور پر اظہار فرمایا ہے:

> ''اب جب کہ جذباتی رومانیت جس کی جھلکیاں آج بھی مجھ جیسے معمر شاعر کی غزلوں میں کم وبیش پائی جاتی ہیں دم توڑ رہی ہیں اور تعمیری ادب اس کی جگہ لے رہا ہے۔ میرے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ملّت کے ان ہونہار نوجوانوں کو جو شعر وادب سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ان عناصر سے واقف کرواؤں جو جدید غزل کے لیے ضروری ہیں۔ وقت کے تقاضے غزل کا مزاج بدل چکے ہیں اب اس میں جذبات کو کم اور مقصدیت کو دخل زیادہ ہونا چاہیے۔
>
> (صدارتی خطبہ مشاعرہ اسلامیہ کالج وانمباڑی)

ڈاکٹر وحید کوثرؔ نے اپنے ایک مضمون ''یسیرؔ بہ حیثیت استاذ'' میں ان کے شعر پر اصلاح دینے کا طریقہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ذیل میں اس سارے اقتباس کو پیش کیا جا رہا ہے تاکہ یسیرؔ کی اصلاح کی باریکیوں کی وضاحت ہو سکے:

> ''یسیرؔ کے اصلاح دینے کا طریقہ جیسا کہ اکثر اساتذہ کا ہوتا ہے کہ ایک ایک شعر شاگرد کی غزل کا چنتے جائیں اور اسی وقت اصلاح دے دیں ایسا نہیں ہے اور نہ ان کی شعری اصلاحات ادبی معرکہ آرائی کا نام ہیں۔ وہ اپنے تلامذہ کی تخلیقات کو قمیص کی جیب میں محفوظ کر لیتے اور گھر سکون سے ان کو پڑھتے۔ اصلاح دیتے اور ضروری ہدایت کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا

پرسکون پہلو اس منزل پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ اس مقام پر ایک نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چناں چہ شاگردوں کی تخلیقات کو پُرسکون ماحول میں جانچتے پرکھتے اور ہر زاویہ سے ان پر غور کرنے کے بعد اصلاح دیتے ہیں:

☆ بے وزن اشعار پر اصلاح نہیں دیتے۔ وہ صرف ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔
☆ متروک الفاظ کو استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔
☆ غزل طویل ہو اور اشعار میں خیالات دوہرائے گئے ہوں تو منتخب اشعار پر اصلاح دیتے ہیں۔
☆ اشعار کو مہمل ہونے سے بچانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ایہام اور تعقید کو عیوب شعری قرار دیتے ہیں چناں چہ ایسے اشعار پر توجہ نہیں دیتے۔
☆ نومشق شعراء کے ہاں اگر جدّت اور تخیل کارفرمائی دیکھتے ہیں تو وہ بھی پوری دلچسپی کے ساتھ ایسے اشعار کی نوک پلک درست کرتے ہیں۔
☆ اشعار میں جذبات اور خیالات کا اظہار پاکیزگی سے ہو تو پسند کرتے ہیں۔
☆ وہ الفاظ کے تلفظ اور مفہوم کے صحیح استعمال کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔
☆ غزل کی زبان کا پاس ان کے یہاں شدّت سے ہے وہ چاہتے ہیں کہ زبان غزل کی زبان ہو۔
☆ روزمرہ محاورات اور زندگی ابدی حقیقتوں کو اشعار میں خوبی پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

(یسیؔر بحیثیت استاد، ڈاکٹر وحید کوثؔر ماہنامہ شاہین، جولائی 1984، ص۔9)

ڈاکٹر رضی الدین احمد نے حضرت غضنفر علی زیدیؔ اور امیر علی خاں یسیؔر کی اردو خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان دو اساتذہ نے کرنول کی موجودہ اردو نسل کی ذہنی تربیت میں بڑا حصہ ادا کیا فرماتے ہیں:

''زیدی صاحب مرحوم کرنول کے ان مقبول اساتذہ میں سے تھے جنھوں نے اپنے طور، طریق، طرز اور طبیعت سے کرنول کی اس نئی نسل کی ساخت پرداخت کی تھی جو آج اس علاقہ کا اصلی ادبی سرمایہ اور سوغات ہے۔ زیدی صاحب مرحوم اردو کے معلم تھے۔ اتنے مقبول محترم اور مشفق معلم جن کی شاگردی فخر

فراست کی کان تھی حضرت یسؔیر پیشے کے لحاظ سے معلم نہیں ہیں لیکن اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے ایک ادارے کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ میں نے کرنول میں ہر جگہ خواہ محفل ہو، مسجد ہو، مدرسہ ہو یا کوئی خانقاہ ہو کسی نہ کسی طور پر طرز یا طریقے سے یا حضرت زیدی مرحوم کی شفقت استادی اور عظمت کے چرچے سنے یا حضرت یسؔیر کی مقبولیت اوران کی شعر وادب سے محویت کی شیریں اور شفاف کہانیاں اردو کے فروغ وفخر اور فراست وفسوں کا سارامنبع ومدار یا اردو کے معلمین کی شخصیت اور شعور پر ہے یا اردو شعراء کے شوق وشائستگی پر اس لیے میرا اندازہ اور احساس ہے کہ کرنول کی موجودہ اردو نسل کی ذہنی تربیت اور تدبر کا سارا مواد مصالحہ انھیں دو حضرات کا تیار اور مرکب کردہ ہے۔'' (نفیر شوق، پیش لفظ، ڈاکٹر رضی الدین احمد، ص۔ 19-18)

موصوف کوخود بھی اپنی اردو خدمات کا احساس تھا کہ وہ کس طرح نئی نسل کو اردو شعر وسخن کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اس بات کا اظہار انھوں نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں بھی نہایت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: ؎

میرے اندازِ تغزل نے سکھایا ہے یسؔیر
عندلیبان گلستان کو غزلخواں ہونا

....

علامہ یسؔیر نے زندگی بھر شادی نہیں کی مجرد رہے اور یہی وجہ بھی ہو کہ ان کے کلام میں رنگینی و رعنائی، رومانیت اور تازگی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین احمد اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''حضرت یسؔیر نے ایک سچے عاشق اور پکے موحد کی طرح اسلام کی ان دو نعمتوں میں سے بھی صرف ایک ہی پر قناعت کی ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں کی خاص گنجائش تھی۔ البتہ یک گیر ومحکم گیرے کے اصول پر ایسا عمل کیا کہ صرف شاعری ہی ان کی شخصیت ان کا شوق اوران کی پہلی اور آخری شادی ہے۔''

(نفیر شوق، پیش لفظ، ڈاکٹر رضی الدین احمد، ص۔ 27)

ڈاکٹر صدیق قیسی قمر نگری نے یسیرؔ کی اصول پسندی کو ان کی شادی کی راہ میں مانع قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ ایک اصول پسند شاعر تھے اور اپنے اصولوں پر آپ نے اپنی زندگی کی ساری آسائشیں قربان کر ڈالیں تاحیات مجرد رہے۔"

(مقالہ کرنول کا اردو ادب میں حصہ آزادی سے پہلے، ص۔285)

مذہبی طور پر یسیر علی خان سنی تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ عالم بھی تھے۔ انھیں بھی غالبؔ کی طرح اپنے علم اور مرتبے کا بڑی حد تک احساس تھا۔ ان کے کلام میں بھی بعض مخصوص الفاظ کا استعمال ان کی عالمانہ شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ اولیاء اللہ اور رسول مقبول ﷺ کے مدح خواں تھے۔ ان کی لکھی ہوئی نعتوں اور منقبتوں سے ان کی گہری عقیدت اور احترام کا پتہ چلتا ہے۔ وہ نعتیہ اور منقبتی مشاعروں میں شریک ہونے کو اپنے لیے بڑی سعادت تصور کرتے تھے۔ چناں چہ کرنول کی بارگاہوں میں اعراس کے موقعوں پر ہونے والے مشاعروں میں شریک ہو کر کلام سنایا کرتے تھے اور ساتھ میں اپنے شاگردوں کو بھی مشاعروں میں شریک ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ بیرونی مشاعروں میں مدعو کیے جاتے تو اپنے کسی سینیر شاگرد کے ہمراہ ان مشاعروں میں شریک ہوتے۔ یہی وجہ بھی ہے کہ جہاں جہاں ان کے کلام میں تصوف جھلکتا ہے وہ اسی عقیدت واحترام کا نتیجہ ہے۔

ان کے نزدیک مسلمان سے مراد مُلائے مسجد نہیں تھا۔ وہ اسلام کو ایک حرکی مذہب تصور کرتے تھے اور اس کا بنیادی عنصر انسانی فطرت کو قرار دیتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے جو ظاہری اعتبار سے متشرع نظر آتے تھے۔ یسیر نے ہر ایک کا احترام اور عزت دائرہ اسلام میں رہ کر کیا۔ کسی سے پرخاش نہیں رکھی۔ جو لوگ ان کو برا بھلا ان کی اصول پسندی کی وجہ کہا کرتے تھے۔ یسیر نے ایسے لوگوں پر کبھی توجہ نہیں کی۔ اپنے اصولوں پر سختی سے پابند رہنا ان کا مزاج تھا جو کسی طرح بدلا نہ جا سکتا تھا۔

ایک واقعہ راقمہ نے ڈاکٹر وحید کوثر سے سنا ہے کہ جب عثمانیہ کالج کرنول کی سلور جوبلی کا انعقاد نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہو رہا تھا۔ تو اس واقعہ پر شعبۂ اردو کی جانب سے بھی ایک آل انڈیا

مشاعرے کا انعقاد کرنا طے پایا۔ اس وقت ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی عثمانیہ کالج کے شعبہ اردو عربی وفارسی کے صدر تھے۔ اس مشاعرے میں شمالی ہند سے بھی کئی شعراء بلائے گئے تھے جن میں فنا نظامی کانپوری بھی شامل تھے۔ مشاعرے کے بڑے بڑے پوسٹر سارے شہر کے اہم مقامات پر لگائے گئے تھے جن میں بیرونی شعراء کے نام اور تخلص کو واضح انداز میں چھاپا گیا تھا۔ ایک صاحب نے یسیر صاحب سے کہہ دیا کہ مقامی شعراء کو تو مدعو کیا گیا ہے لیکن ان کے نام اور تخلص پوسٹرز میں نہیں ہیں۔ یہ ایک طرح کی مقامی شعراء کی بے عزتی ہے۔ نہ جانے یہ بات یسیر صاحب کو کتنی غلط معلوم ہوئی وہی جانیں۔ انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے اور ان کے شاگرد بھی اس مشاعرے کا بائیکاٹ کریں گے۔ یہ خبر کالج کے انتظامیہ کو معلوم ہوئی۔ فوری فاروقی صاحب یسیر صاحب کے پاس چلے آئے اور ان سے تسامح ہونے کا اقرار کرلیا۔ معافی چاہی اور مشاعرے میں شریک ہونے پر راضی کرنے کی ہر ممکن کی کوشش کی لیکن یسیر صاحب نے مشاعرے میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا شریک نہ ہوئے۔ البتہ مشاعرہ گاہ سے دور رہ کر مشاعرے کی سماعت کی۔

نفیر شوق کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے خود یسیر صاحب نے جو لکھا ہے اس سے ان کے مزاج اور اشاعت سے متعلق ان کے مقصد کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے۔ اس لیے اس سارے بیان کو ذیل میں نقل کیا گیا ہے:

> ''1964ء میں مولانا ابولفضل سید محمود صاحب حیدرآبادی جو اس زمانے میں یہاں عہدۂ سب جج پر مامور تھے۔ وہ پہلے کرم فرما ہیں جنھوں نے مجھے کلام طبع کروانے کا مشورہ دیا جس کے لیے میں ممدوح کا ممنون ہوں۔ کلام کی طباعت کے تعلق سے احباب کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر میں نے 1975ء میں مجموعہ کلام مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اگر کلام کسی بیاض میں اکٹھا ہوتا تو یہ کام آسان تھا۔ یہاں تو صورتِ حال یہ تھی کہ کلام کاغذ کے پُرزوں پر لکھا مختلف جگہوں میں بکھرا پڑا تھا جو بھی مل سکا میں نے اسے اکٹھا کر کے مجموعہ کی شکل دی۔ پیش لفظ کے تعلق سے نظریاتی اختلاف نے طباعت کے کام کو کافی لمبی مدت کے لیے سرد خانہ کی نذر کردیا۔ میرا یہ خیال رہا کہ اس حقیر مجموعہ کو مقدمہ یا پیش

لفظ کی گرانباری سے دور رکھوں کیوں کہ ''مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار گوید''
اور احباب کا برابر یہ تقاضہ رہا کہ ملک کے کسی ممتاز تنقید نگار سے پیش لفظ لکھوایا
جائے وہ میرے لیے ایک اعلیٰ قسم کی بیساکھی مہیا کرنا چاہتے تھے جو مجھے نہ پسند
تھی۔طباعت سے جب میرا مقصد نجات نہیں صرف کلام کو محفوظ کرنا ہے تو پھر
اس مقصدِ براری کے لیے کسی بیساکھی کی ضرورت ہی کیا۔اس لیے احباب سے
معذرت کے ساتھ اس حقیر مجموعہ کو بغیر پیش لفظ چھپوانے کا تہہ کر ہی لیا تھا کہ
میرے مکرم دوست ملک الشعرائے آندھرا پردیش حضرت اوجؔ یعقوبی صاحب
حیدرآبادی نے مجھے مشورہ دیا کہ پیش لفظ کا ہونا ایک عصری تقاضا ہے اور اس کا
لکھنوانہ لازمی ہے۔میرے فیصلے نہایت اٹل ہوا کرتے ہیں لیکن اس معاملے
میں حضرت اوجؔ کے مشورہ کو وزنی پا کر اس معاملہ پر غور و فکر کی ٹھان لی اور پھر
محترم ڈاکٹر رضی الدین احمد صاحب میرٹھی صدر شعبہ اردو، فارسی و عربی تروپتی
یونیورسٹی سے پیش لفظ لکھنے کی خواہش کی جسے موصوف نے از راہِ تلطف منظور
فرمایا۔'' (نفیرِ شوق، گفتنی از امیر علی خان یسیرؔ ص۔36,37)

چناں چہ 1980ء میں دیوان ''نفیرِ شوق'' شائع ہوا لیکن اس کی رسم اجراء اور جشنِ یسیرؔ کا اہتمام 18 اکتوبر 1981ء کو عمل میں آیا۔اس جشن کے تین اجلاس مقرر ہوئے جس کی تفصیل ڈاکٹر صدیق قیسیؔ قمر نگری نے اس طرح بیان کی ہے:

''کرنول میں 18 اکتوبر 1981ء کو انتہائی عظیم الشان پیمانہ پر جشنِ یسیرؔ منعقد کیا
گیا جس کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی، ڈاکٹر رضی الدین
احمد نے پُر مغز تقاریر کیں۔دوپہر محفل مقالات میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید،
ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی، ڈاکٹر سید محمود قادری فیضیؔ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور راقم
الحروف (صدیقی قیسی قمر نگری) نے مقالے پڑھے۔رات طرحی مشاعرہ منعقد
ہوا جس کی صدارت علی احمد جلیلی نے فرمائی۔مصرع مطروحہ ''تپشِ شوق نے ہر
ذرہ پہ اک دل باندھا'' پر نیرنگؔ، قاصدؔ، سوزؔ، کوثرؔ، راقمؔ، محمودؔ، سلام، شاعرؔ،

گرامی، جمیل، رنج، انجم، شاہین، کاظم، فائق لطیف، شیدا نعیم، عقیل، فیضی،
سرور، مرزا، خواجہ شوق، بشیر وارثی، یسیر اور صدر مشاعرہ نے کلام سنایا۔"

(مقالہ کرنول کا اردو ادب میں حصہ آزادی سے پہلے، ص۔ 287)

شری وینکٹیشورا یونیورسٹی نے یسیر کے کلام کو ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کیا۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی نے تروپتی گلبرگہ کی یونیورسٹیوں سے یسیر پر تحقیقی و تنقیدی مقالے لکھوائے۔ انٹرمیڈیٹ 2004ء کے نصاب میں پہلی مرتبہ یسیر کے تعارف کے ساتھ ان کی ایک غزل نصاب میں شامل کی گئی۔ یسیر کے کلام کا جائزہ کئی پہلوؤں سے لیا گیا لیکن راقمۃ الحروف کو یسیر کے کلام کی رومانیت پر کام کرنے کا خیال آیا۔ اس موضوع پر کسی نے بھی توجہ نہیں کی ہے۔

میرا مقصد یہی ہے کہ یسیر کی شاعرانہ خوبیوں اور خصوصیات کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ان کی رومانی فکر پر خاص توجہ صرف کی جائے۔

یسیر کرنولی آخری حالت میں مفلوج الحال تھے۔ یہ حملہ انتہائی معمولی تھا۔ بہت جلد سنبھل بھی گئے۔ ان کا معمول تھا گرما کے موسم کے شروع ہوتے ہی شعر کہنا بند کر دیتے تھے بلکہ کوئی دماغی کام سے اجتناب برتتے تھے۔ گرما کے بعد جب بارش کا موسم آتا اور ایک دو مرتبہ بارش ہو جاتی تو پھر شعر کہنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چناں چہ صحت سنبھل جانے کے بعد پھر موسم برسات سے شعر کہنا بھی شروع کیا تھا۔ یہ کلام اس مجموعہ نفیر شوق میں شامل نہیں ہے۔ صحت کے سنبھل جانے کے بعد ان کی بہن کا انتقال ہو گیا۔

اس صدمے کا اثر ان پر بہت زیادہ رہا۔ بہن کے انتقال کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ 1408 ہجری ماہ رمضان کی سولہویں تاریخ تھی 1988ء صبح پیر پھسلا کہ سیڑھیوں پر سینے کے بل گرے۔ سینے میں شدید درد محسوس کرنے لگے۔ ہسپتال لے جانے کی کوششیں ہو رہی تھیں کہ انتقال ہو گیا۔ اسی روز درگاہ حضرت مولا مسکن رحمۃ اللہ علیہ سے متصل قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

یسیر نے اپنے جن ہم عمر شعراء کا ذکر نفیر شوق میں کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور شعر تھے جن سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے یسیر کے ساتھ مشاعرے پڑھے کرنول کی علمی و ادبی فضاء کو

مہکایا۔ ایسی چند اہم شخصیتوں میں مخدوم حسینی ماہرؔ، مولانا عبدالغنی غنیؔ، آغا کذپوی، یحییٰ خان، معذورؔ، عبدالمنان رنجؔ، سید شاہ لطیف پاشاہ قادری لطیفؔ، حاجی میاں غازیؔ، فائقؔ ترکمانی ندیالی، قابلؔ ادھونوی، زعیمؔ ندیالی وغیرہ ہیں۔ یہ سارے شعراء فنی پختگی کے ساتھ فکروفن کی کم و بیش وہی خصوصیات کے حامل تھے جن کو اہم روایتی غزل کے عناصر سے جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دورِ یسیرؔ کا عہد کہلایا جاسکتا ہے جس کو ہم 1940ء سے 1980ء تک زمانہ قرار دے سکتے ہیں۔ یسیر کے انتقال سے اردو شاعری میں ایک عہد کا خلا قائم ہوگیا۔

●●●

کلامِ یسؔیر میں رومانیت

یہ بات اکثر تسلیم کی جاتی رہی ہے کہ شاعر ہو یا ادیب اپنے کلام اور اپنی ادبی تخلیق کا نقاد بھی ہوتا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ جب وہ اپنی تخلیق پر غور کرتا ہے تو اس کو فنی اور ادبی معیاروں پر جانچتا بھی ہے۔ اس کی یہی پہچان اس کو اپنی تخلیق کا پہلا نقاد بنا دیتی ہے۔ اس جانچ اور پرکھ کے دوران اپنی تخلیق میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کرتا ہے، اس کی نوک پلک درست کرتا اور پھر اس کو اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اسد اللہ خاں غالؔب کے بارے میں بھی یہ بات مشہور ہے کہ وہ جب کوئی غزل کہہ لیتے تو پہلے خود اس کے ہر شعر پر غور کرتے اور اس کی نوک پلک درست کرلیا کرتے تھے اور پھر اپنے عزیز دوست مرزا مصطفےٰ علی خان شیفتہ کو سناتے۔ شیفتؔہ کے متعلق غالؔب کا خیال تھا کہ ان کی انتقادی صلاحیت نہایت عمدہ ہے۔ جب شیفتہ غالب کو غزل میں جن اشعار کے رکھنے کا مشورہ دیتے غالب ان کے علاوہ دوسرے اشعار غزل سے نکال دیتے تھے۔ اس طرح غالب کے کلام میں جامعیت پیدا ہوگئی تو دوسری جانب وہ حشو زائد سے بھی پاک ہوگیا اور غالب کو اپنے کلام کے بارے میں خود رائے قائم کرنے کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ امیر علی خان یسؔیر کی قد آور شخصیت کے پیشِ نظر ہمیں یہ بات دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ خود یسؔیر کے کلام کی تخلیق کے دوران کیا اس طرح کا کوئی عمل در پیش رہا ہے۔

یسؔیر کے ایک ہم عصر مولانا عبدالمغنی غنؔی کہا کرتے تھے کہ یسؔیر جب کوئی نئی غزل لکھ لیتے تو سب سے پہلے وہ غزل انھیں سنایا کرتے تھے اور پھر ان کے کہنے پر بعض اشعار کاٹ بھی دیتے تھے۔ یہ بات اس لیے بھی زیادہ صحیح تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ''نفیر شوق'' میں یسؔیر نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس مجموعہ کی ترتیب، تصویب اور تدوین میں مکرم الحاج سید عبدالغنی صاحب غنؔی منشی فاضل نے میری جو اعانت فرمائی ہے اس کے لیے صاحب موصوف کا شکر گذار ہوں۔'' (نفیر شوق، گفتی، ص۔40)

اب رہا خود یسیؔر کا کلام ان کی نظر میں کتنی اہمیت کا حامل تھا۔ اگر چہ یہ بات تنقید کے میدان میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی پھر بھی نقادوں کے لیے ایک راہ ہموار ضرور کرتی ہے۔ چوں کہ یسیؔر کی شاعری کا دور قریب نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے اور اس دور میں سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکوں نے سر اٹھایا تھا۔ اور یہی زمانہ ان کی ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کا دور رہا۔ اس لحاظ سے کیا یسیؔر نے اپنے دور کی ان تحریکوں سے اثر قبول کیا ہے اور یہ تحریکیں یسیؔر کے نزدیک کس حد تک اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یسیؔر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ان کا دور اور اس کی سرگرمیاں ان کے سامنے آئینہ کی طرح صاف تھیں۔ یسیؔر نے اپنے دور کی ادبی تحریکوں اور تغیر و تبدل میں رومانی نظریات کو اپنے لیے چنا جو ان کے مزاج اور ماحول سے میل بھی کھاتے تھے۔

سالانہ منعقدہ 16 مارچ 1975ء کو منعقدہ اردو، فارسی اور عربی اسلامیہ کالج وانمباڑی (ٹمل ناڈو) کے سالانہ جلسہ کے خطبۂ صدارت میں حضرت یسیؔر نے اپنے کلام پر رائے دیتے ہوئے فرمایا تھا:

''بزرگو اور دوستو!

روحِ عصر ایک عالم کرب و اضطراب سے گذر رہی ہے۔ سکون و عافیت کی متلاشی انسانیت اس سرمدی کیفیت و لذت کو ترس رہی ہے جو اسے یقین کی پُر اسراریت اور رومانوی ماورائیت ہی فراہم کر سکتی ہے۔ اس عالمگیر اضطراب کے سائے میں رومانوی ادب اُبھر رہا ہے اور ایک نئی طرز کی رومانویت جنم لے رہی ہے۔ رومانویت نام ہے جذبے اور وجدان کے ارتقاع کا۔ عرفانِ حیات و کائنات میں فکر سے کہیں بڑھ کر کارفرمائی جذبے اور وجدان کی ہوا کرتی ہے۔ اس لیے کائنات اور خالق کائنات تک پہنچنے کے لیے خود کو نہیں عشق ہی کو راہبر بنانا ہوگا جو ہمیں پایانِ منزل تک پہنچا سکے۔ یہ امر یقینی ہے کہ مقصد، جذبے اور

وجدان کے بغیر تعمیری ادب پروان نہیں چڑھ سکتا۔ تعمیری شاعری وہ ہے جو ایسی ارتقائیت کو اپنائے جو درد و غم کی منزلوں سے گذرتی ہوئی انسانیت کو حقیقی زندگی کی راہوں پر ڈال سکے۔ لذت انگیز شاعری مخربِ اخلاق ہوا کرتی ہے اس لیے لذت انگیز رومانویت کو تعمیری شعر و ادب سے بے دخل رکھا جائے۔ تعمیری شعر و ادب وہ ہے جو حقیقت آمیز رجائیت پر مبنی ہو اور دلکش سے دلکش قنوطیت کو اس میں جگہ نہ ہو۔ رجائیت نام ہے امید پروری کا اور یہ امید پروری ایک گہرے یقین ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ سوز و ساز کا کارواں یاسیت کی پرچھائیوں میں بڑھ نہیں سکتا اور وہ راہ کے پیچ و خم میں کھو جائے گا۔ اس کاروان کو تو امیدوں کے سہارے اور یقینِ منزل رسی کے چراغ جلائے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس قسم کی رجائیت کو میں نے اپنی کسی غزل کے ایک شعر میں یوں پیش کیا ہے: ؎

عزمِ منزل جنونِ جہد و عمل
زندگانی کے تانے بانے ہیں

(مذکورہ خطبۂ صدارت کی کاپی راقمۃ الحروف نے ڈاکٹر وحید کوثر سے حاصل کی ہے)

یسیرؔ نے اس خطبہ میں اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ جذباتی رومانویت کی جھلکیاں آج معمر شعراء کی غزلوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں، دم توڑ رہی ہیں اور تعمیری شعر و ادب اس کی جگہ لے رہا ہے۔

اوپر پیش کیے گئے یسیرؔ کے بیان سے جو اہم بات واضح ہو جاتی ہے وہ ان کا ایک رومانی شاعر ہونا ہے۔ چوں کہ اب تک جتنے مقالے اور مضامین یسیرؔ پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ یسیرؔ ایک رومانی شاعر تھے۔ بلکہ اکثر بڑے نقادوں نے بھی ان کی شاعری میں کلاسیکی شعراء کی طرح حسن و عشق کی تلاش کی ہے یا پھر غزل اور تغزل کے عناصر ہی سے بحث کی ہے۔ ان میں رومانویت اور اس کی کسوٹی پر یسیرؔ کے کلام کو جانچنے کا رجحان ملتا ہے۔ راقم الحروف نے یہ محسوس کیا کہ جب شاعر ہی نے اپنے کلام کو رومانوی عناصر کا نمائندہ کلام کہا تو یہ ہماری ذمہ داری بن جاتی ہے کہ ہم اس کے کلام کو رومانوی عناصر کی کسوٹی پر پرکھیں۔ زیرِ نظر

مقالہ راقم الحروف کے اسی خیال کا حاصل ہے۔

یسیرؔ کے کلام کو جانچنے میں ناقدین یسیر سے یہ تسامح اس لیے بھی ہوا کہ ان کی غزلوں میں غالبؔ کا ڈکشن پایا جاتا ہے جس کی بنیاد پر ان کو ''غالبِ دکن'' بھی کہا گیا۔ لیکن غالب کا کلام رومانوی عناصر سے بہت حد تک خالی ہے۔ رومانوی تحریک غالب کے دور سے مغرب میں پروان چڑھ رہی تھی۔ مشرق بالخصوص ہندوستان کی زبانوں اور اردو زبان پر اس کے کوئی اثرات اس وقت مرتب نہیں ہوئے تھے۔ جو بھی حسن و عشق سے متعلق خیالات شعراء کے یہاں ملتے ہیں وہ رومانویت سے قریب ضرور ہیں لیکن ان کو شعوری طور پر رومانوی اندازِ فکر سمجھ کر اشعار میں پیش نہیں کیا گیا۔ غالبؔ کے یہاں بھی جو عشقیہ شاعری کے عناصر ہیں وہ رومانوی نہیں کہلائے جاسکتے ہیں۔ یسیرؔ نے غالب کی سنگلاخ زمینوں میں شعر ضرور کہے ہیں جس سے ان کی مشکل پسندی کے رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کے شعری ڈکشن، غالب کی شعری زمینوں اور مشکل پسندی کو سامنے رکھ کر یسیرؔ کے ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یسیرؔ کی شاعری تقلیدی ہے۔ انھوں نے ساتھ ہی یہ محسوس کیا کہ یہ مکمل تقلیدی بھی نہیں ہے۔

اوج یعقوبی لکھتے ہیں:

> ''یسیرؔ نے بڑی لکیر پر لکیر کھینچنے کا فرسودہ طریقہ کار اختیار نہیں کیا اس کے برخلاف انھوں نے اپنی انفرادیت اور اپنے وجود کی پہچان کے لیے علٰحدہ خط کھینچے ہیں۔ اگر ان خطوط کو دیانت داری کے پیمانے سے ناپا جائے تو یہ کسی استادِ سخن کی قامت سے ہرگز کم نہ ہوں۔''
>
> (نفیرِ شوق، تعارف از اوج یعقوبی، ص۔7)

یہاں جس بات کا بیان کرنا مقصود ہے کہ یسیرؔ نے غالبؔ یا دیگر اساتذہ سخن سے ہٹ کر جو علٰحدہ خط کھینچے وہ کون سے تھے۔ جن کو دیانت داری سے جانچنے سے یسیرؔ کے استادِ سخن ہونے کا ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک یسیرؔ نے اپنی مشکل پسند طبعیت کے پیشِ نظر غالبؔ کے ڈکشن کو اپنایا ضرور ہے لیکن فکری اعتبار سے وہ غالب سے بہت دور ہیں۔ غالب کی عقلیت یسیر کے وجدان سے میل نہیں کھاتی۔ غالبؔ نے فکر کو اہمیت دی ہے۔ یسیرؔ نے جذبے کو اہم قرار دیا

ہے۔اس لحاظ سے غالبؔ اور یسیرؔ دو الگ راہوں اور روشوں کے مسافر ہیں اور ہر ایک اپنی راہ و روش سے اچھی طرح آگاہ ہے اور اس پر چلنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔

یسیرؔ کے کلام کو خود ان کی حیات میں جانچنے اور پرکھنے کا موقعہ ادب کے اہم ناقدین کو اس لیے بھی نہیں ملا کہ یسیرؔ کا کلام کسی ملکی اور بین الاقوامی پرچوں میں شائع نہیں ہوا۔ان کی شہرت صرف رائلسیما یا بہت سے بہت حد تک آندھراپردیش کی سرحدوں میں قید رہی۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ جنوبی ہند میں مختلف مقامات پر ہونے والے مشاعروں میں مدعو کیے جاتے رہے۔ جہاں ہندوستان کے بڑے بڑے شعراء بھی شریک ہوتے تھے۔لیکن کسی ایک دو مشاعروں میں شریک ہوجانے سے ایک یا دو غزلیں سنا لینے سے شاعر اور اس کے کلام سے آگہی ممکن نہیں چنانچہ انہیں مشاعروں کی حد تک یسیرؔ کی شہرت مقید ہو کر رہ گئی۔ بہت ممکن ہے یسیر کے غزل گو ہونے نے بھی ان کی اہمیت و عظمت کی شناخت میں روڑے اٹکائے ہیں۔جس زمانے میں انھوں نے شاعری شروع کی وہ زمانہ نظم کی ترقی کا زمانہ تھا۔نظم لکھنے والے شعراء کی مقبولیت نے غزل گو شعراء کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔یوں بھی رومانویت کے اہم شعراء اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری وغیرہ نے اس دور میں نہ صرف رومانی تحریک کو فروغ دیا بلکہ نئی اردو نظم کو بھی اپنا کر اس کی ترقی کی راہیں ہموار کردیں لیکن چند ایسے غزل گو شعراء اس دور میں بھی موجود تھے جنھوں نے رومانیت کو غزل ہی کے ذریعے فروغ دیا ان میں حسرتؔ، جگرؔ وغیرہ اہم ہیں۔

یسیرؔ بھی انھیں شعراء کی صف میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے رومانیت کو غزل کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔یسیرؔ کے ساتھ انصاف اس لیے بھی نہیں کیا جاسکا کہ یسیرؔ کی شہرت علاقائی حدود کو نہ توڑ سکی اور انھیں اس زمانے میں غزل گو اور وہ بھی روایتی غزل گو سمجھ کر ان کے کلام کے تجزیے پر توجہ نہیں دی گئی۔افسوس اس بات کا بھی ہے کہ کلام کی اشاعت کے بعد بھی جو رجحانات پہلے سے یسیرؔ کے بارے میں بن چکے تھے وہی یسیر کے کلام کا نئے سرے سے جائزہ لینے میں رکاوٹ بنے رہے۔

بہ ہر حال یہ کہنے میں راقم کو کسی طرح کا پس و پیش نہیں کہ یسیرؔ کی غزل رومانی غزل ہے۔ رومانیت کے وہ سارے عناصر یسیر کے کلام میں مل جاتے ہیں جن کا ذکر پچھلے باب میں کیا گیا ہے۔ ''نفیرِ شوق'' کے سرِ ورق پر یسیرؔ کرنولی کی تصویر دی گئی ہے جس کے اوپر یہ شعر موجود ہے: ؎

مجھے ہیجان آب و گُل نہ سمجھو
کسی کے سازِ ہستی کی صدا ہوں

....

یسیر کی رومانیت اپنی ذات کی اساس پر بغیر کسی ہیجان کے حقیقت کی گہرائی تک پہنچنے کی سعی کرتی ہے۔ اس ذات کا اِدراک کرنا اتنا آسان بھی تو نہیں جس کی سازِ ہستی نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ اس کے حسن کا کیا عالم ہوگا کہ جس کی ذات کے پرتو نے اس کائنات کو جو صرف اس کی بے معنی سی تصویر کے سوا کچھ نہیں۔ یسیر کا ذوقِ دیدار دیکھیے کس قدر اس حسن حقیقت تک رسائی کے لیے بے چین ہے: ؎

اب تصور بھی مجھے وجہ سکونِ دل نہیں
ان کا عالم اور ہے عالم جدا تصویر کا

....

رومانوی شاعر محبوب کے حسن کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو پھول کی خوبصورتی میں، بہار کی طرب افزاء فضاء میں دل کی گہرائیوں میں، تمنا کی آنکھ میں حتیٰ کہ خزاں کی افسردگی میں دیکھتا ہے۔

یسیر کی نظارگی کا عالم ملاحظہ ہو: ؎

افسردہ خزاں ہو کہ بہارِ طرب افزاء
ہر آئینہ میں حسن ترا مدِّ نظر ہے

....

وہ جلوۂ رنگیں جو سرِ راہ گذر ہے
صاحب نظراں کے لیے فردوسِ نظر ہے

....

تو دل کی تاب، چشمِ تمنا کا نور ہے
اتنا قریب ہو کہ نگاہوں سے دور ہے

....

کس قدر شفاف ان کے حسن کا ماحول ہے
بن گیا ہے خیر سے منظر کا منظر آئینہ

....

کس تجمل سے ہوا کرتے ہو گل میں عکس ریز
جانے کس نے رکھ دیا گلشن کے اندر آئینہ

....

یا نکل آئے یکایک پردۂ رنگیں سے وہ
یا دھرا ہے سامنے قد کے برابر آئینہ

....

ہم بنیادی طور پر رومانی شعراء کے یہاں حسن کی جستجو پاتے ہیں۔وہ عملی دنیا میں اپنے لیے جو حسن اور مسرت نہیں پاتے اپنی خیالی بہشت میں اس کی تخلیق کرتے اور اس حسن میں کھو کر آسودگی حاصل کرتے ہیں۔رومانیت کا بہت بڑا جزو حسن کے اعلیٰ ترین مقام تک رسائی ہے۔یہی ان کی زندگی کا مقصدِ اصلی ہوتا ہے۔یسؔیر فرماتے ہیں:

ہر نفس محبوب کی آواز ہے
زندگی بجتا ہوا اِک ساز ہے

....

جلوۂ یار کی رکھتے ہیں تمنا ہم بھی
آؤ دیکھیں سرِ طور تقاضا ہم بھی

....

یسؔیر کا رومانی تخیل آسمانوں پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے۔یسؔیر نے عقل سے زیادہ جذبے، وجدان اور دل پر زور دیا ہے اور دل حسن کا چاہنے والا اور عشق میں گرفتار رہنے والا ہے یہ حسن عورت سے لے کر مناظرِ کائنات اور حسنِ مطلق تک اپنا ایک تسلسل رکھتا ہے۔

ذیل کے اشعار میں یسؔیر کے مختلف تجربات ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ حسن کا مقام ان کے نزدیک کیا ہے:

نہ پوچھو حسن میں کیا دیکھتا ہوں
غمِ دل کا مداوا دیکھتا ہوں

....

جمالِ بزم آرا دیکھتا ہوں
ترا ہر شئے میں جلوہ دیکھتا ہوں

....

میں کہاں حسن لا جواب کہاں
آنکھ کو دیکھنے کی تاب کہاں

....

وہ میری چشمِ حقیقت نگر سے چھپ نہ سکے
چمک رہا ہے پسِ پردۂ تجلّی رنگ

....

رومانی شعراء کے پاس حسن کی کرشمہ سازیاں عجیب ہوتی ہیں۔ حسن دل کو وہ پاکی اور صافی عطا کرتا ہے جس کے آگے ساغرِ جم مانند نظر آنے لگتا ہے۔ حسن کی خوبی کا وہ اعلیٰ ترین معیار رومانی شعراء کے یہاں ہوتا ہے کہ وہ اس رعبِ حسن سے گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یسیرؔ فرماتے ہیں:

پرتوئے حسن نے آئینہ بنایا دل کو
اب تو زمانے میں کہیں ساغرِ جم ہو کہ نہ ہو

....

ہم کو عرضِ حال کی جرأت کہاں
ان کے رعب حسن سے گھبرا گئے

....

اظہار مدعا کی جسارت کہاں یسیرؔ
گھبرا گیا ہوں حسن کا معیار دیکھ کر

....

حسن کی عظمت کا احساس جس قدر بلند اور بے مثل ہوتا ہے وہ دراصل رومانی شاعر کے تصور میں کیف وحسن کی محفل سجاتا ہے اور وہ حسن کی رعنائیوں میں گم ہو کر ماورائے شبستان میں زندگی کے چند لمحے گذار لیتا ہے:

رنگینیٔ لطافتِ خلوت کا واسطہ
پھر خلوتِ خیال میں آیا کرے کوئی

....

اللہ اللہ! سحر کاری حسن کی
گوشے گوشے پر نظر کے چھا گئی

....

زندگی کی تلخیاں، زندگی کی مشکلیں اسی وقت سہل اور آسان ہو سکتی ہیں جب خیال حسن یار کی لطافتوں کو سہارا بنا لیا جائے۔ یسیرؔ فرماتے ہیں:

اس کو احساسِ حقیقت سے نکھارا
زندگی، تلخ، حقیقت ہی سہی

....

یسیرؔ! اگر تجھے احساسِ تلخیٔ غم ہے
تو کیوں حیات کا ماحول خوشگوار نہ ہو

....

یسیرؔ جمالیاتی کیف و سرور کی تصویر کشی کرنے میں جس جذبے اور وجدان کا سہارا لیتے ہیں وہ صد فیصد رومانی ہے وہ حسن کو بیان کرنے میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں حسن کے سوا اس وقت کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ان کے وجدان اور الفاظ کی رنگینیٔ اشعار میں گہرا تاثر پیدا کر دیتی ہے۔ حسن کے بیان میں رومانی شعراء کی عینیت پسندی یسیرؔ کے یہاں بھی پوری طرح نمایاں ہے۔ فرماتے ہیں:

جانے کس کی راہ تکنے کو یسیرؔ
ذرّہ ذرّہ راہ کا بینا ہوا

....

تجلیات نے عالم بدل دیا ہے نیسؔر
نہ بیر دیر سے مجھ کو نہ اب حرم کا لحاظ

....

تعمیر اگر حسن ہے تخریب بھی تو حسن
ہر آنکھ نہیں حسن کی تکرار سے واقف

....

چمن میں حسن نکھرا جارہا ہے
یہ کس نے پردۂ گلگوں سے جھانکا

....

جس نے دیا نظر کو غرور مشاہدات
دل میں اتر کے حسن وہی درد ہوگیا

....

تری تلاش میں وارفتگی کا حال نہ پوچھ
مجھے تلاش پہ اپنا سراغ بھی نہ ملا

....

خلوت میں تخیل کی وہ مستِ شباب آیا
گلہائے محبت سے کھینچ کھینچ کے گلاب آیا

....

اس حسن کی تابش بھی تھی مانعِ نظارہ
جب ایک حجاب اٹھا اک اور حجاب آیا

....

حسن گل و لالہ میں تاب مہ و انجم میں
اس جان تمنا کا کس کس میں جواب آیا

....

یسیؔر نے حسن کے بے شمار پہلوؤں کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ ان سب کا احاطہ کرنا اتنا آسانی نہیں۔ ان کا پیش کیا ہوا پہلو رومانی فکر اور جذبے وجدان کا نمائندہ ہے۔ ہر پہلو سے تازگی، تابندگی اور برجستگی کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔ یسیؔر نے حسن میں وہ توانائی دکھائی ہے جو کسی اور شئے میں ممکن نہیں۔ ان کی تصوریت بارگاہِ حسن میں قدم قدم پر سجدہ ریز معلوم ہوتی ہے۔ کلام یسیؔر ایک طرح سے حسن کی دل آویزیوں کا مرقع ہے جس کا معیار تمام تر ذوقی اور وجدانی ہے۔

فرماتے ہیں:

کہاں خیال کو گذر حریمِ حسن ذات میں
اُلجھ کے رہ گئی خرد طلسم کائنات میں

....

اس شاہدِ جمال پہ مرتا رہا یسیؔر
روشن ہیں جس کے فیض سے چودہ طبق ہنوز

....

پروفیسر ظہور الدین کا خیال ہے کہ:

''بیشتر رومانی شعراء اس بات پر متفق ہیں کہ شاعری کا جادوئی عنصر تخیل کا کرشمہ ہے اور اس کا تعلق کسی ایسی مافوق الفطرت قوت کے ساتھ قائم ہے جس کا اِدراک حواس خمسہ نہیں کر سکتے۔ اس مافوق الفطرت کا ادراک رومانیت کا مطمع نظر ہے اور اس کی تلاش میں رومانی ایک ماورائی دھند میں کھوجاتا ہے اور ستاروں پر یوں نظر جماتا ہے کہ کرۂ ارض فراموش ہوجاتا ہے۔ وہ حقیقت الٰہی کے ساتھ خود فراموش کے عالم میں رشتہ قائم کرتا ہے اور اپنے لاشعور کے ذریعے اس مقامِ عرفان کو سر کر لیتا ہے جہاں شعور پر بھی نہیں مار سکتا۔''

ایک رومانوی مفکر سر مورائس باورا کا قول ہے کہ تخیل اگر اس انداز میں عمل پیرا ہو تو اس پر زندگی سے فرار کا الزام عائد کرنا مناسب نہیں۔ کیوں کہ رومانیت کا رشتہ صرف خیالی دنیا سے ہی قائم نہی ہوتا بلکہ خیال اور حقیقت کے امتزاج سے عمل کی سعی بھی کرتا ہے۔ کلاسیکیت جس مافوق

الفطرت قوت کی تلاش خارج میں کرتی ہے رومانیت اس قوت کو انسان کے داخل میں پالیتی ہے۔''

یسیر فرماتے ہیں:

ہم جس کو زمانے میں عبث ڈھونڈ کے آئے
وہ غم کدۂ دل کا مکیں ہو ہی چکا تھا

....

جنونِ عشق نے آگے بڑھایا
خرد کی منزلوں سے ماورا ہوں میں

....

ذرّے ذرّے کو نگارستاں بتاتا ہوں یسیر
اتنا جو ہر سے جہاں عشق کے بہزاد میں

....

رومانی شعراء کا عشق، عشقیہ شاعری کے عاشق کی مریضانہ ذہنیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس میں بوالہوسی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ رومانوی عاشق، خلوص، ایثار، سپردگی، بے نیازی اور محبوب کی مرضی و مزاج کے آگے سرِ ختم تسلیم کرتا ہے۔ اس عشق میں اُلفت ہی اس کی رہنمائی و رہبر ہوتی ہے۔ جو عشق کی آگ میں جلتا ہے وہ بے شمار خوبیوں کا حامل ہو جاتا ہے۔ اگر چاہے تو وہ قوتِ عشق سے ایک نئے عالم کو ایجاد کر سکتا ہے۔ یسیر کے اشعار دیکھیے:

ارادوں کو نہیں ہے دخل اُلفت کے تقاضوں میں
یہ اندازِ جنوں ہوتے ہیں اپنے طور پر پیدا

....

راہ الفت میں رہبر ہو نہ ہو کیا غم ہمیں ہمدم
ہم اپنی آگہی سے کر ہی لیں گے راہبر پیدا

....

تپ تپ کے سوزِ عشق میں دل فرد ہو گیا
اس آگ میں جو کود پڑا مرد ہو گیا

....

جذبۂ عشق کے اِک اِک تاثر کو نیسرؔ
نقش بر عالمِ ایجاد کروں یا نہ کروں !

....

ڈاکٹر یونس حسینی نے ورڈز ورتھ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے (جس کو راقم نے پروفیسر ظہور الدین کی کتاب جدید ادبی تنقید نظریات سے اخذ کیا ہے)۔ ورڈز ورتھ نے لکھا ہے:

''ہم شعراء جوانی میں مسرت سے ابتداء کرتے ہیں لیکن انجام بالا آخر مایوسی اور ہذیان ہوتا ہے۔'' یہ الفاظ اس کرب کے مظہر ہیں جن سے رومانی فنکار دوچار ہوتا ہے۔ اس قسم کے فنکار معاشرے کے نامیاتی ''کُل'' کا جزو بننے سے قاصر رہتے ہیں اور انھیں زندگی کے خارج اور داخل میں بُعدِ عظیم نظر آتا ہے۔ ماضی حال سے بہتر دکھائی دیتا ہے اور مستقبل آرزوؤں کا مرکز بن جاتا ہے۔ تضاد کی اس فضاء میں مسرت لمحۂ گریزاں کی طرح اس کی گرفت میں نہیں آتی اور رومانی فنکار ان گریزاں کیفیات کے تعاقب میں سرگرداں رہتا ہے اور انھیں اپنے تخیل میں گرفتار کر کے ایک تخلیقی شکل دے دیتا ہے چناں چہ لوکس (Lucas) نے رومانیت کو پرستاں کے ایسے شہزادے سے تشبیہ دی ہے جو حسن خوابیدہ کی تلاش کر رہا ہے اور اس کے تھکے ماندے جسم کو الف لیلی کی خیالی شہزادی سکون مہیا کرتی ہے لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو زندگی کی بے رحم حقیقتیں مایوسی اور نامرادی سے دوچار کر دیتی ہے۔

(ڈاکٹر یونس حسنی، اختر شیرانی کی رومانی شاعری، رسالہ کراچی، ص۔ 39)

مذکورہ اقتباس میں رومانیت کو انفعالیت سے قریب کرنے کی سعی کی گئی ہے لیکن رومانیت کا مزاج انفعالی نہیں رہا ہے۔ یہ کئی حیثیتوں سے فعال بھی ثابت ہوئی ہے۔ اس نے کئی ملکوں کے حالات کے بدلنے میں مدد دی ہے۔ جو مایوسی اور غم رومانی شعراء کے یہاں ملتا ہے وہ فانیؔ اور میرؔ کے غم سے مختلف ہے۔ عمل سے فرار یا حال سے دامن بچالیتے کا تصور اس میں نہیں ہوتا۔ یہ تو رومانی شاعر کے جوہرِ قابل کا نچوڑ ہوتا ہے۔

یسیرؔ فرماتے ہیں:

غم سے مفر ہوں کیوں کہ غم سے نمودِ زندگی
کشمکشِ حیات کا عشق میں حل تلاش کر

....

غم اگر قصۂ اُلفت کا خلاصہ ہے یسیرؔ
غم کا احساس مرے جوہرِ قابل کا نچوڑ

....

دے گیا روئے تمنا کو بہاروں کا نکھار
غم میری زیست کا ، پہلو سے نمایاں ہوکر

....

اے دلِ مبتلائے غم، کیفِ حیات کے لیے
کسبِ نشاط ، غم سے کر درد وغم کے باوجود

....

غمِ دل کا سہارا لے رہی ہے زندگی میری
کرم اے عشق تیرا میں نہیں ہوں بے سہاروں میں

....

پروفیسر ظہورالدین کا خیال رومانی غم پسندی کے بارے میں یہ ہے کہ:

''رومانی ادب کی تہہ میں غم کی جو لہر ملتی ہے وہ ان حادثات کی دین ہوتی ہے جو وجدان اور جذبے اور اِدراک کے مقام اتصال پر رونما ہوتے ہیں اور جن کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وجدان اور جذبے کے قوانین کو رنگ و بُو کی دنیا پر نافذ کرنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ معلوم ہوتا ہے۔ حالات کی یہ مساعدت غم کا روپ اختیار کر کے ادیب یا شاعر کی نس نس میں اتر جاتی ہے۔ یہ احساس شکست اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ چناں چہ اپنے وجود کے تحفظ کے لیے اس کے سوائے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ وہ اپنے سارے درد و

کرب کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر تخلیق کی صورت میں پیش کر دے۔ اس کا یہی درد و کرب نئی دنیاؤں کی دید و دریافت کو ممکن بناتا ہے۔ اسی کی مدد سے مصور رنگوں میں روح پھونک دیتا ہے۔ مجسمہ ساز پتھروں میں دھڑکن پیدا کر دیتا ہے اور موسیقی کار کائنات کے ایک ذرّے کو پردۂ ساز میں منتقل کرتا ہے۔"

(جدید ادبی و تنقیدی نظریات از پروفیسر ظہور الدین ص۔62)

یسیؔر کے غم کے رنگ ذیل کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیے:۔

قیدِ غمِ حیات کا ٹوٹے کیا طلسم
جُز مرگ راستہ نہیں کوئی فرار کا

....

غم ملا خوب ہوا مشعل روشن کی طرح
زندگی برق طلب تھی مری خرمن کی طرح

....

غمِ جاناں سے وابستہ نفس کو
یسیر زار نامِ زندگی دے

....

مرا سوز میری دولت مرا غم مرا خزانہ
مجھے عشق نے دیا ہے یہ مقامِ خسروانہ

....

رہے داغِ دل سلامت پئے شوق والہانہ
ہے یہی بنائے اُلفت ہے یہی چراغ خانہ

....

رومانی شعراء کا غم ان کی آرزو بھی ہوتا ہے اور ان کی قوت بھی۔ اگر اس میں کمی آجائے تو پھر اس کا غم بھی لاحق ہو جاتا ہے گویا غم ہی ان کی دولت، غم ہی ان کی قوت اور غم ہی حاصل عشق و حیات ہوتا ہے۔ یسیؔر کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہو:

کہیں احساسِ غم کم ہو نہ جائے
مجھے پھر دوہرا غم ہو نہ پائے

....

سرِ بزم آنکھ پُر نم ہو نہ جائے
ثبوتِ غم فراہم ہو نہ پائے

....

دل کو غمِ حیات و غمِ آرزو بھی ہے
غم حاصل سرشت ہے غم سے مفر نہیں

....

اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومانیت ایک خاص اندازِ فکر کا نام اور زندگی کا محور کا مخصوص رویہ ہے۔ اس میں ہر برائی، سختی، غلامی اور پابندیوں سے بغاوت کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تحریک نے معاشرے کو کثیف سطح سے بلند کرنے اور لطیف کی وسطوں سے ہمکنار کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یسیرؔ کا غم جہاں ان کا غم دل ہے وہیں غم کائنات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ ان کا غم اندر ہی اندر سلگتا ہے اور اس کی آگ سے وہ جو شعور حاصل کرتے ہیں وہ خلوص و ایثار کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

فرماتے ہیں:

بہار اشکِ خوں سے ہم گذر جاتے تو اچھا تھا
نگارِ زندگی میں رنگ بھر جاتے تو اچھا تھا

....

راہِ وفا میں کئی بار جاں پہ کھیل گئے
یسیرؔ دامنِ ایثار داغ دار نہیں

....

فرق ایثار میں آئے نہ وفاؤں میں یسیرؔ
کوئی صورت پئے تخفیفِ الم ہو کہ نہ ہو

....

اس کو ایثار کی راہوں پہ لگا
زندگی ایک امانت ہی سہی

....

دیکھو مجھے ایک کشتۂ ایثار وفا ہوں
لاؤ تو کہیں سے کوئی مجھ سا مرے آگے

....

خلوص عشق کو ، ایثار کو، وفاؤں کو
رہِ نیاز میں کس کس کو روبہ کار کریں

....

اردو کے رومانی شعراء کے یہاں ایثار اور وفا کی وہ کیفیت جو یسؔیر کے پاس ملتی ہے، شاید ہی کسی کے کلام میں ملے۔ جذبہ ایثار کی توقیر اگر سمجھنی ہو تو یسؔیر کے ان اشعار کو پڑھیے کہ جن میں جذبہ کی شدت کس قدر خیال میں اثر پیدا کر رہی محسوس کر پائیں گے:

جذبۂ ایثار کی گرمی کا عالم دیکھنا
دیر تک ٹپکا لہو فتراک سے نخچیر کا

....

وہی سر ہے جو جھک جائے تری شمشیر کے آگے
یہ جاں کی چیز ہے ایثار کی توقیر کے آگے

....

وہ بدگمان تھے حالِ زبوں سے بھی اے یسؔیر
کھانی پڑی قسم مرے ایثار کی مجھے

....

ان پر مر مر کے محبت میں جیئے جاتا ہوں
اور ایسے میں مجھے جذبۂ ایثار نہ چھیڑ

....

ہزار بار اگر جاں ملے نثار کروں
یہ مشغلہ ہے ترے جاں نثار کے قابل

....

جس شاعر کے جذبہ ایثار کا یہ عالم ہو اس کے اخلاق و اخلاص کا کیا عالم ہو گا ذیل کے ان دو اشعار سے اندازہ لگایئے:

ہے کون یسیرؔ جگر افگار سے کمتر
نظروں سے کسی کو بھی گرانا نہیں آیا

....

خوئے تسلیم تو بھی ڈال یسیرؔ
یہ بھی ہے اِک قرینۂ اخلاص

....

یسیرؔ متنوع جہات کے شاعر نہیں ان کی رومانیت ایک خاص حسن اور اس سے عشق کا حاصل ہے۔ جنھوں نے یسیرؔ کے کلام کو صرف حسن عشق کی قدیم داستان سمجھا انھوں نے اس کو سطحی جاذبیت والی شاعری یا پھر نوجوانوں کو متاثر کرنے والی شاعری سمجھا۔ اسی طرح جنھوں نے یسیرؔ کے کلام میں غالبؔ کی عقلیت ڈھونڈنے کی کوشش کی انھیں بھی ٹھوکر لگی۔ انھیں یسیرؔ بلند فکر کا شاعر نظر نہیں آیا۔ یسیرؔ کی شاعری رومانی ہونے کے باوجود ایک مردانہ لہجہ رکھتی ہے جس میں ان کے خوابوں، آرزوؤں اور تمناؤں کی فضاء قاری کو مسحور کرتی ہے۔ ان کے یہاں شکستِ آرزو کا پہلو بھی نمایاں ہے لیکن یہ پہلو فرار یا قنوطیت کا متبادل نہیں۔ یہ شکست بھی لذت دل میں اضافے کے ساتھ رجائیت کو اجاگر کرتی ہے۔

یسیرؔ کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے:۔

محبت نے سکھائے ہیں قرینے عزم وہمت کے
ارادے کے موافق ہو ہی جاتا ہے جگر پیدا

تمہاری یاد جو آئی حسین راتوں میں
جگر میں درد نے اٹھ اٹھ کے احترام کیا

....

جب آرزو ئے دید ہوئی گرمِ تقاضا
وہ شاہدِ گل پردہ نشیں ہو ہی چکا تھا

....

آئے بھی وہ کب کہ یسیرؔ جگر افگار
رہ دیکھ کے پیوند زمیں ہو ہی چکا تھا

....

اے یسیرؔ اُلفت میں چپ کی داد ملتی ہے
خاموشی کا ہنگامہ بے اثر نہیں ہوتا

....

چھڑک کے دامنِ حسرت پہ آرزو کا لہو
بنا لیا ہے الگ میں نے گلستاں اپنا

....

دامانِ تمنا کو سمیٹے رہے پھر بھی
نو میدی کے کانٹوں سے بچانا نہیں آیا

....

یسیرؔ کی رومانیت میں شکست آرزو کے باوجود آنسوؤں اور آہوں کی کمی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں رجائیت کا فقدان نہیں۔ وہ اپنے خوابوں کے شکستہ ہونے اور تمناؤں کے پورے نہ ہونے پر بھی حوصلہ سے دست کش نہیں ہوتے۔ عزم و ہمت سے راہِ وفا میں جمے رہنے ہی کو توقیر محبت تصور کرتے ہیں:

قائم ہے مرے ضبط سے توقیر محبت
ہر ظلم پہ اِک شور مچانا نہیں آیا

....

ترے ستم کی کرم گستری کا ہوں ممنوں
کہ اضطراب میں آرام آگیا اے دوست

....

یسیرؔ نے جہاں حسن کو ازلی و ابدی حقیقت بنا کر پیش کیا ہے وہیں ان کے یہاں محبوب (عورت) کے ملکوتی حسن کی اہمیت بھی نظر آتی ہے۔ اس کے زلف و رخسار سے گرمی حاصل کرنے، اس کی ذات سے ماحول کو رنگین بنا دینے، اس کی راہوں کے معطر ہو کر مہک جانے کی باتیں بھی کلامِ یسیرؔ میں ملتی ہیں۔

عشق میں محبّ و محبوب کی بے قراری، الزام کے ہر دو طرف لگنے کا احساس، عشق کی ارضیت کی نمائندگی کرتا ہے:

کھلتے ہیں پھول باغِ تمنا میں ہر روش
آتی ہے جب بھی ان کے لبوں پر ہنسی کی موج

....

تذکرہ ہے لب و رخسار کا کس خوبی سے
رو کشِ لعل و گہر ہے مرے خط کا کاغذا

....

رس گلوں کا سمو دیا کس نے
نو بہار شباب ہے عارض

....

زلف بکھرے تو پھر گہن ہو جائے
مہ نہیں مہتاب ہے عارض

....

سلجھ سکے نہ کبھی پیچ بخت تیرہ کے
انھیں رہا تری زلفوں کے پیچ و خم کا لحاظ

....

گیسو میں اُلجھ کے مطمئن ہے
آسودۂ دام ہو گیا دل

....

جس راہ گزرے تو گزرے اس راہ گزر کا کیا کہنا
اس خاک کے ہر ذرّے ہیں خورشید ہیں ہم مہتاب ہیں ہم

....

پائے اگر نہ سایۂ گیسوئے التفات
تم ہی کہو کہ جائے غریب الوطن کہاں گز

....

مرتا ہوں ذکرِ قامت و گیسوئے یار پر
اتنا حسین فسانہ دارو رسن کہاں

....

وہ آبھی جائیں تو دیکھنا پھر بساطِ دل گلستاں رہے گی
روش روش موجِ نزہتِ گل رواں رہے کی رواں رہے گی

....

اگر کمالِ یگانگت سے وہ مسکراتے ادھر سے گذریں
فضائے دل جلوہ زارِ یمن، تو رہ گذر کہکشاں رہے گی

....

اس ارضی تصورِ عشق میں فراق کا پہلو بھی ارضی ہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غزلیات کے دفتر میں فراق اور ہجر کے مضامین کو سو سو طرح سے باندھا گیا ہے اور آج کے اس دور میں مضمون کی تکرار کی وجہ ایک اُکتاہٹ سی پیدا ہو گئی ہے لیکن یسیرؔ کا تصورِ فراق چوں کہ ایک رومانی شاعر کا تصورِ فراق ہے۔ اس لیے اس میں جو افسردگی اور حزنیہ کیفیت پائی جاتی ہے اس میں ایک گومگو کیف موجود ہے۔

ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے:

وہ چھا گئے خیال پہ تو پھر کہاں کی نیند
آیا نہ پاس تک بھی تنوم شبِ فراق

....

پھر ساحلِ مراد کی انگڑائیاں نہ پوچھ
آئے جو بحرِ غم میں تلاطم شب فراق

....

چھیڑتا ہے اپنے آپ جو دل میں رُباب غم
ہوتا ہے ہر نفس میں ترنم شب فراق

....

اس سلسلے میں یسیر کی ایک پوری غزل حوالے میں پیش کی جا سکتی ہے جس کی ردیف ''جواب بھی نہ آؤ تو کب آؤ گے گم'' ہے۔ اس غزل میں جذبہ وتخیل ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور ساتھ ہی غم میں وہ کیف وسرمستی ہے کہ قاری جھومنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

تڑپ آتشِ غم کو بھڑکا رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم
جنونِ طلب پر بہار آ رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

اُمیدوں پہ تکیہ کیے جا رہاں ہوں حسیں آرزوں پر جیئے جا رہا ہوں
حیات آرزوؤں میں اُلجھا رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

کہیں یہ محبت زدہ زندگانی نہ بن جائے غم کی ادھوری کہانی !
طبیعت نتیجے سے گھبرا رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

یہ دردِ مسلسل یہ سوزِ فروزاں نہ جینا ہی آساں نہ مرنا ہی آساں
قضا سخت جانی پہ بل کھا رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

قسم مجھ کو اپنے حسین مدعا کی کوئی چاہ دل میں نہیں ماسوا کی !
صفائی صفائی پہ اترا رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

رہ عشق میں یہ مرا عزم تازہ عروسِ تمنا کے چہرے کا غازہ!
مجھے اپنی منزل نظر آرہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

حسیں رات ہے، چاندنی ہے سیانی فضاؤں کی ساغر بکف ہے جوانی
خوشی غم کے ماحول پر چھا رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

گلستاں گلستاں فروغِ بہاراں ہواؤں میں مستی فضاؤں میں روماں
گھٹا پیار کی پیار برسا رہی ہے جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

سماں دیدنی ہے دمِ واپس کا نہیں کوئی ہمدم یسیرؔ حزیں کا
اجل غم کی گتھی سلجھا رہی ہے جو اب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم

رومانی شعراء کے یہاں ''شوق'' ایک بنیادی محرکہ ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک شوق ہی وہ قوت عطا کرتا ہے جو منزل سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ بعض وقت شوق، تمنا اور آرزو ایک ہی معنوں میں بھی مستعمل ہوئے ہیں۔

نفیرِ شوق کے شاعر نے نفسِ شوق اور ساحلِ شوق کے ساتھ صبحِ تمنا، دامانِ تمنا، جہانِ تمنا، ریاضِ تمنا، اضطرابِ تمنا اور تاکِ تمنا وغیرہ جیسے الفاظ اپنے اشعار میں بھرپور ایمائیت کے ساتھ استعمال کیے ہیں:

کون رو کے جذبۂ بے اختیارِ شوق کو
ان کی شمعِ رُخ پہ دل پروانہ وار آ ہی گیا

....

حیات جبر مشیت ہے خیر مان لیا
نوائے شوق مشیت شکا رہے ساقی

....

اشکِ غم زخمِ جگر داغِ تمنا کی بہار
پوچھیے ان سے دلِ زمزمہ پر داز کا راز

....

کھلتے ہیں پھول باغ تمنا میں ہر روش
آتی ہے جب بھی ان کے لبوں پر ہنسی کی موج

....

اور بھی ہو گئی بے تاب تمنا دل کی
فائدہ کچھ تو ہوا ضبطِ فغاں کے باعث

....

سنبھل اے دل کہ ذوقِ دید میں پھر اضطراب آیا
تمنا میں تڑپ آئی تقاضوں پر شباب آیا

....

چھڑک کے دامنِ حسرت پہ آرزو کا لہو
بنا لیا ہے الگ میں نے گلستا ں اپنا

....

اشک سے شادابی کشتِ تمنا ہو گئی
دیدۂ نمناک میں اِک آبیار آہی گیا

....

آرزو بے تاب دل بے چین بھٹکی سی نظر
خود تڑپ کر اِک بھری محفل کو تڑپانا پڑا

....

یسیرؔ کے شوق، آرزو اور تمنا جیسے الفاظ میں ایک انوکھا انداز اور خیال وعمل کے مختلف پہلو سمٹ آئے ہیں۔ کہیں ان میں عزمِ دشوار بھی ہے تو کہیں عزمِ تازہ بھی ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

ودائی عشق کی ظلمت میں دکھا جو ہرِ عزم
ہر نظر صبحِ تمنا کی کرن ہونے تک

....

کتنی انگڑائیاں لیتا ہے مرا ساحلِ شوق
قلزمِ عزم کی ہر موج رواں کے باعث

....

کیسی ہراس تیرگی راہِ عشق میں
ہرموڑ پہ جلایئے عزمِ جواں کی شمع

....

اضطراب عزم منزل ہی سے ہے سعی طلب
مدعائے دل مرا بے دست و پا ہوتا نہیں

....

یسیرؔ جانتے ہیں کہ وہ رومانیت جو مریضانہ ذہن کی حامل ہو شاعر کو اور معاشرے کو ایک نشے میں ڈوبا دیتی ہے جہاں جہدِ مسلسل کی آرزو فوت ہو جاتی ہے۔ قوم وملت اور ملک و مذہب کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف حقیقت پسندانہ رومانیت غم سے فرار نہیں حاصل کرتی بلکہ اس سے رنگین راہیں نمودار ہوتی ہیں کیوں وہ جانتی ہیں کہ زندگی کہ شوق آرزو اور سعی مسلسل ہی کا نام ہے۔ یہ ساری چیزیں حیات کو رنگین بنانے کے لیے اتنی ہی ضروری ہیں جتنی غذا اور ہوا۔ آج وقت کے تقاضے بدل گئے ہیں۔ آج صرف تخیل کی حسین اور اور خیالی دنیا میں کھوئے رہنے سے کام چلنے والا نہیں ہے۔ یسیرؔ کو حقیقت پسندانہ رومانیت کا شاعر کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے رومانیت کے جس دل نشیں پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے وہ ایک طرف غزل کی غزلیاں کو بھی باقی رکھتا ہے تو دوسری طرف حقیقت پسندی

کو اُجاگر بھی کرتا ہے۔
چند اشعار پیش ہیں:

تقاضے بذلہ سنجی چاہتے ہیں عصر حاضر کے
یسیرؔ اب وقت کو اہلِ سخن کی آزمائش ہے

....

زندگی سعی مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
دورِ زماں کی فکر نہ برقِ بلا کی سوچ

....

بربطِ غم کی ہے یہ شام و سحر
عزم و ہمت کے گیت گاتا ہوں

....

غم سے رنگین راہیں نکلتی رہیں
اشکِ خوں سے بہاریں اُبلتی رہیں

....

لالہ و گل پہ حق ہے مرا دوستو
میں نے بھی خون دیا ہے چمن کے لیے

....

یسیرؔ کا وجدان صرف ایک سرمدی مستی کا نام نہیں۔ وہ جب کسی خارجی حادثہ کا شکار ہوتے ہیں یا پھر کسی تجربہ سے ان کا ذہن متاثر ہوتا ہے جس سے وہ ایک ایسی روشنی حاصل کرتے ہیں کہ وہ ان کے تخلیقِ شعر کا باعث ہوجاتی ہے۔ خارجی دنیا کا کوئی حادثہ جب احساس سے ٹکراتا ہے تو اِدراک کی روشنی شاعر کی ذات سے پھوٹتی اور اس کے اطراف کے ماحول کو روشن کردیتی ہے۔ یسیرؔ کا انداز اتنا پیارا ہے کہ وہ قاری پر حادثوں کی تلخی اور ان کا بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ اس سے حیات کی راہوں میں عزمِ تازہ کے پیدا کرنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ یسیرؔ کے ان الفاظ کو جو علامتوں کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی دو جہتیں ہیں ایک حقیقت نگاری کی طرف اشارہ کرتی ہیں تو دوسری رومانی پیکر تراشی معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حقیقت

پسندانہ رومانیت میں تاثیر کی شدت پیدا ہوگئی۔ قاری ان کے خارجی حادثوں کے اثر سے زیادہ باطنی تجربات اوراحساس کی شدت سے متاثر ہوتا ہے۔

یسیؔر کی زبان زیادہ مشکل نہیں البتہ کلام بعض قدیم الفاظ جیسے ابتسام، اشتداد، تنوم، انفراغ، ان الفاظ کے ہم معنی الفاظ کو جو زیادہ سہل اور رواں ہیں۔ یسیؔر استعمال کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر رضی الدین احمد لکھتے ہیں:

''حضرت یسیؔر محض شاعر ہی نہیں بلکہ عالم بھی ہیں اور انھیں بھی غالبؔ کی طرح اپنے علم اور مرتبہ کا بڑی حد تک احساس بھی ہے۔ یہی احساس بعض خالص الفاظ کے استعمال کی ضرورت میں ان کے ہاں علم کا اظہار بن گیا ہے۔ چناں چہ غالبؔ ہی کے رنگ کا ایک رُخ یہ بھی کہ بعض مروجہ اور مقبول الفاظ کی بجائے وہ الفاظ بار بار استعمال کیے گئے ہیں جو چاہے ازروئے قوائد درست ہوں گے مگر عام طور پر مروج اور مقبول نہیں ہوں۔''

(نفیر شوق پیش لفظ از ڈاکٹر رضی الدین احمد، ص۔22)

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یسیؔر نے فن شعر کو پوری توجہ کے ساتھ برتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ غالبؔ کی زمینوں میں غزل کہنا آسان نہیں۔ اس کے لیے اسیروں جگر کے لہو کو پانی کرنا پڑتا ہے۔ وہ صرف اور صرف غزل کے شاعر تھے۔ غزل خود یسیؔر کے زمانے میں معتوب صنف سمجھی گئی۔ یسیؔر کو اس بات کا احساس بھی رہا کہ کیا غزل کا دور میرؔ و غالبؔ اور مومنؔ کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ ان کے نزدیک غزل ایک صنف ہے جس کا نشہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ جب ک شاعر غزل کہنے کے لیے عشق سے سوزِ دروں حاصل کرے تو پھر فکر کے چمن میں معانی کے بے شمار پھول کھلنے لگتے ہیں۔

یسیؔر کے یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

غزل میں سوز رکھ دیا ہے
یہ حصہ تھا یسیؔر نکتہ داں کا

شعر کہنا نہیں بازیچہ اطفالِ یسیرؔ
فن کو کرنا ہو اُجاگر تو کرو فن کی طرح

....

یوں بھی غالبؔ کی زمینوں میں غزل کہنا یسیرؔ
فکر کے کہسار سے لانا ہے جوئے شیر کا

....

کیا ساتھ میرؔ و غالبؔ و مومنؔ کے اے یسیرؔ
انداز دل فریبی صنف سخن گئے

....

شعر کہنے کی ہے کیوں یسیرؔ آرزو پانی ہوتا ہے سیروں جگر کا لہو
فکر کا بادہ لفظوں کے جام وسبو میکدہ چاہیے اک سخن کے لیے

....

وجد میں آئے نہ کیوں محفل یسیرؔ
دستِ شاعر میں غزل کا ساز ہے

....

عشق سے سوز لیا بہرِ غزل ہم نے یسیرؔ
چمنِ فکر سے گلہائے معنی مانگے

....

یسیرؔ اپنے علاقے میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر ہے لیکن یسیرؔ کی کسرِ نفسی بھی بے مثال ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان جیسا غزل گو قرب جوار میں نہیں: ؎

اللہ رے جرأت کہ یسیرؔ جگر افگار
کرتا ہے غزل گوئی کا دعویٰ مرے آگے

وہ اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ:

جہاں میں ایک کو ہے دوسرے پہ فوق یسؔیر
کرے نہ اس لیے فن کار اپنے فن کا گھمنڈ

کسرِ نفسی کا عالم دیکھیے:

اب عیب ہے ہنر تو ہنر عیب ہے یسؔیر
اچھا ہوا کہ عیب ہیں ہم میں ہنر نہیں

یسؔیر ایک صوفی کی طرح صلحِ کُل کا مزاج رکھتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین سے کبھی بدلہ لینا ان کو نیچا دکھانا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ فرماتے ہیں:

ترا مسلک تو صلح کُل ہے یسؔیر
بد گماں تجھ سے کیوں زمانہ ہے

....

میں یسؔیر صلح جو ہوں مجھے بیر کیا کسی سے
جہاں شاخِ آشتی ہو کہ مرا آشیاں وہیں ہے

....

یسؔیر بحیثیت مجموعی ایک حقیقت پسند رومانی شاعر تھے۔ انھوں نے ہر بڑے شاعر کی زمینوں میں شعر کہہ کر اپنے استادِ سخن کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ فکر کے لحاظ سے وہ ہر رومانی شاعر سے کم نہیں ان کی فکر رومانیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ وہ ایک رومانی شاعر کی طرح مجسمِ غم تھے۔ لیکن غم ان کے چہرے سے کبھی آشکار نہ ہوا۔ وہ ناموسِ عشق اور حسن کی توقیر پر مر مٹنا جانتے ہیں۔ انھیں اس کا اندازہ تھا کہ حسن کے پرستاروں کا شیوہ نرالا ہوتا ہے۔ ان کے قصۂ غم ہستی کو مختصر نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً اب پھر کوئی یسؔیر جیسا رومان پسند شاعر اس علاقے میں پیدا ہو جائے ممکن نہیں معلوم ہوتا ہے۔

نئے انداز میں شعر کہنے والے لاکھوں شاعر پیدا ہوں گے لیکن یسؔیر پھر کہاں:

سچ تو یہ ہے غمِ مجسم ہوں
پھر بھی غمِ رُخ سے آشکار نہیں

....

وہ بندۂ وفا سے ہے پرستارِ حسن ہے
بے وجہ کیوں یسیرؔ کو رسوا کرے کوئی

....

قصۂ غمِ ہستی وسعتوں کا حامل ہے
لاکھ مختصر کیجیے مختصر نہیں ہوتا

....

●●●

ناقدینِ یسیرؔ

ناقدینِ یسیرؔ کے نام ذیل میں درج ہیں:

- ڈاکٹر رضی الدین احمد
- ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
- ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی
- ڈاکٹر نجم الہدیٰ
- ڈاکٹر اوج یعقوبی
- ڈاکٹر وحید پاشاہ قادری کوثرؔ
- ڈاکٹر یعقوب شریف

اس سے قبل ہم نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اردو کے بڑے ناقدین نے یسیرؔ کے کلام پر خامہ فرسائی نہیں کی ہے اوراس کی وجہ بھی ہم نے یہ بتائی ہے کہ یسیرؔ کی شہرت آندھراپردیش یا پھر جنوبی ہند تک ہی محدود رہی۔ یسیرؔ کا کلام اردو کے بڑے ناقدین تک پہنچ ہی نہیں پایا۔ یسیرؔ نے اپنے کلام کو کبھی کسی اردو کے اہم پرچے، رسالے یا اخبار میں اشاعت کے لیے روانہ کیا ہی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ بہت سارے اردو کے ناقد نہ سہی کئی اہم ناقدین کم ازکم ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالتے اوران کے کلام کی خوبیوں اور خصوصیات کو عوام سے روشناس کراتے۔ یسیرؔ کے معاملے میں ایسا نہ ہونا ایک طرح سے یسیرؔ کی گمنامی کا سبب بنا ہے۔ یسیرؔ کے مزاج میں جو شہرت سے گریز تھا اس نے بھی یسیرؔ کی شہرت اوران کے کلام کو ناقدین تک پہنچنے سے روکے رکھا۔

یسؔیر نے اپنی زندگی کے پانچ دہائیوں کو تخلیقی ادب میں صرف کر دیا۔ کسی شاعر کا پچاس سال تک اردو شعر و سخن کی خدمت میں لگے رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ باوجود اس کے اس کی شاعری اور اس کی شعری خدمات کو نظرِ استحسان سے نہ دیکھا جانا اس کے لیے سوہانِ روح سے کم نہیں ہو سکتا۔

اس بات کا اظہار یسؔیر نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے اور اپنے مجموعہ کلام کے حصہ گفتنی میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''کرنول ایک ایسا مقام ہے جہاں ہمیشہ ہر اہلِ فن کی بے قدری رہی ہے مجھے اپنے ہم وطنوں سے کوئی شکایت نہیں کہ انھوں نے زبان و ادب کے لیے میری خاموش خدمات کا مجھے کوئی صلہ نہیں دیا۔'' (نفیرِ شوق، گفتنی، ص۔ 37)

یسؔیر کا جو اپنے اہلِ وطن (کرنول والوں سے) گلہ تھا وہ بہت حد تک ''جشنِ یسؔیر'' کے بعد باقی نہیں رہا۔ جشنِ یسؔیر کا انعقاد کر کے اہلیانِ کرنول نے نہ صرف یسؔیر سے اپنی محبت اور ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا بلکہ اپنے شاعر کو اردو کے اہم ناقدین سے متعارف کرانے کا اہم فریضہ بھی انجام دیا۔ جشنِ یسؔیر کے موقع پر ڈاکٹر رضی الدین، احمد، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر سید ابوالفضل محمود قادری فیضؔی، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ملک الشعراء اوج یعقوبی، خواجہ شوق جیسے ناقدین و شعراء کو مدعو کیا گیا اور یسؔیر کے کلام کی خوبیوں کو تحریری یا تقریری انداز میں بیان کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جشن کے مشاعرے میں کلام سنانے سے پہلے یسؔیر نے اپنے اہلیانِ وطن کا اس عزت پر شکریہ بھی ادا کیا۔

جشن کے بعد کلامِ یسؔیر کو پہلی مرتبہ شری وینکٹیشورا یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ سلیمان اطہر جاوید صاحب کی زیرِ نگرانی یسؔیر پر ایم۔ فل کا مقالہ بھی لکھا گیا۔ عثمانیہ کالج کرنول کے شعبہ اُردو کے پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالرّزاق فاروقی صاحب نے بھی یسؔیر کے کلام پر نہایت وقیع خیالات کا اظہار کیا اور اسے مضمون کی شکل میں تحریر بھی فرمایا۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب گلبرگہ یونیورسٹی منتقل ہوئے اور وہاں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے تو انھوں نے یسؔیر صاحب پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کروایا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یسؔیر جیسے

شاعر کے لیے جس کے استادِ سخن ہونے میں کوئی دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ جو کچھ لکھا گیا کافی ہے؟ یہاں یسیر کا گلہ اردو والوں سے ہے:

ایک احسان محفل پہ ایسا بھی ہے
اہلِ محفل کو احساس جس کا نہیں

....

جذبۂ حُسن خدمت کے لیے رات بھر
شمع جلتی رہی انجمن کے لیے

....

یسیر کا یہ غم کہ ان کے فن کو پہچانا نہیں گیا، ان کی قدر دانی نہیں کی گئی باوجود قحط الرجال اور ناقدری کے یسیر نے اپنی عقل و ہوش اور خواب و خرد کو سنبھالے رکھا۔ ایسا ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔ یہ دنیا مردہ پرست بھی ہے اور احسان فراموش بھی۔ اگر آج ادب میں چند اہلِ قلم کو زندہ رکھا گیا ہے، ان کو اور ان کے ادب کو یاد رکھا گیا ہے تو یہ مردہ پرستی ہے اور ایسے کئی فن کار اس گردشِ رواں کی لپیٹ میں آکر گمنامی کے دبیز پردوں میں گم ہوگئے ہیں۔ بہت ممکن ہے مستقبل میں یسیر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ یسیر کے لیے ایک اور بات جو ان کی گمنامی کا باعث رہی ہے، وہ یہ ہے کہ کرنول ملک کے اُردو مراکز سے کافی دور ہے۔ ایسے دورِ افتادہ مقام پر رہنے والے شاعر کے کلام کا تنقید کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کے لیے اردو کے کسی بڑے نقاد کا تیار ہونا اتنا آسان نہیں۔ ویسے آج بھی شمال والے جنوب کے اردو داں طبقہ کو دوسرے درجہ کا طبقہ قرار دیتے ہیں۔

ایسے میں یہاں کے بلکہ ایک دورِ افتادہ علاقہ کے شاعر کے کلام پر توجہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ بھی رہی ہے کہ یسیر کے جو بھی ناقدین ہیں وہ جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی، ڈاکٹر نجم الہدیٰ، ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر وحید کوثر اور ڈاکٹر صدیق قیسی قمر نگری کے نام اہم ہیں۔ ان میں بھی چار نقاد ایسے ہیں جنھوں نے کلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دو ناقدین نے یسیر کے زمانے اور حالات تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھا ہے اور دو میں سے ایک نے

ان کی اصلاحاتِ شعری کو موضوع بنایا ہے تو ایک نے کلام میں طنز کو تلاش کیا ہے۔اس لحاظ سے کلام کی خوبیوں اور خصوصیات پر جن ناقدین نے روشنی ڈالی ہے ان ہی کے نظریات سے ہم اس باب میں بحث کریں گے۔

ڈاکٹر رضی الدین احمد:

شمالی ہند میرٹھ کی ایک اہم شخصیت ڈاکٹر رضی الدین احمد ہیں۔ان کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔ان کے اساتذہ میں رشید احمد صدیقی، خورشید الاسلام اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے ادیب ونقادر ہے ہیں۔ڈاکٹر عبدالحق صاحب کرنولی نے انھیں کرنول آنے پر آمادہ کیا ہے۔ اپنے اسلامیہ کالج میں انھیں تعلیمی خدمات پر مامور کیا۔پھر جب شری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی میں شعبہ اردو، فارسی اور عربی کا قیام عمل میں آیا تب شعبہ میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر کروایا۔ رضی الدین صاحب نے بھی ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی امید کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔رائلسیما کے علاقے میں انھیں کافی شہرت حاصل ہوئی۔یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ان کی شناسائی رسمانہیں تھی۔یہی وہ پس منظر تھا جس کی بنیاد پر یسیرؔ صاحب نے اپنے دیوان ''نفیرِ شوق'' کا پیش لفظ ان سے لکھوانے کا ارادہ کیا۔

نفیرِ شوق کے مطالعہ اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک طویل مضمون کی صورت میں لکھا گیا ہے۔پیش لفظ میں ڈاکٹر رضی الدین احمد نے ڈاکٹر عبدالحق، کرنول اور یسیرؔ تینوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

جہاں تک یسیر صاحب سے ان کی ملاقات اور ربط وتعلق کا معاملہ ہے ڈاکٹر رضی الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''میں نے حضرت یسیرؔ کو سب سے پہلے انھیں مشاعروں (جنوبی ہند کے مشاعروں) میں پڑھتے سنتے سناتے اور داد دیتے اور داد پاتے دیکھا اور خوب خوب دیکھا۔حضرت یسیرؔ سے تعارف تعلق اور تواتر پر چوتھائی صدی سے زیادہ بیت گئی ہے مگر ان کی شاعری، شوق اور شائستگی میں ایسی استواری ایسا استحکام اور ایسا بے پرواانداز ہے کہ حالات وحوادث کا کوئی تغیر کوئی تہلکہ اور کوئی طوفان

ان کو ان کی شاعری کی صراطِ مستقیم، منفعل یا مذبذب نہیں کر سکا۔''

(نفیرِ شوق، پیش لفظ از ڈاکٹر رضی الدین، ص۔12)

یسیر کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے موصوف نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یسیر کا انداز جداگانہ تھا۔

''حضرت یسیر کے کلام سنانے کے انداز میں ایسا نرالا وقعت وقار ہے کہ نہ تو ان کے ہاں جگر کے ترنم کا ذرا سا بھی شائبہ ہے نہ فراق کے تیور کا ذرا سا بھی پرتو پھر بھی لوگ ان کے پڑھنے کے انداز کو پسند کرتے ہیں اور اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ لوگ پوری توجہ سے ان کے کلام کو سنتے ہیں۔ حضرت یسیر شعر اس طرح سناتے ہیں کہ شعر سننے اور سمجھنے کی ساری کی ساری ذمہ داری صرف سامع پر ہوتی ہے۔ سنانے والے پر نہیں۔ حضرت یسیر نے ہر رنگ کے شعر کہنے کی جگہ ہر رنگ کے استادوں کے شعر کہے ہیں۔ اس لیے خود ان کی شاعری کا رنگ بھی استادانہ رنگ ہے۔ ایسا استادانہ رنگ جس میں آزمودہ کاری بہت واضح ہے۔ کرنول کی نئی نسل کو حضرت یسیر کی پروردہ نسل قرار دیا جائے تو یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔'' (نفیرِ شوق، پیش لفظ، ص۔17)

انہوں نے یسیر کو بنیادی طور پر غزل کا اسیر قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''حضرت یسیر نے جس شوق و شائستگی اور شان سے غزل کے فن کو سجایا سنوارا اور سرفراز کیا وہی حضرت یسیر کی وفاداری، وارفتگی اور وفورِ شوق کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔'' (نفیرِ شوق، پیش لفظ، ص۔19)

یسیر کی مشکل پسندی کو غالب اور بیدل کی تقلید کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے:

''حضرت یسیر نے بھی اس قیامت کو دعوت دی ہے اور جگہ جگہ غالب کی زمینوں اور رنگِ بیدل کی ظلمتوں میں پہنچ کر خوب خوب طبع آزمائی کی مگر اس اعتراف

اور اعلان کے ساتھ کہ

یوں بھی غالبؔ کی زمینوں میں غزل کہنا یسیرؔ
فکر کے کہسار سے لانا ہے جوئے شیر کا !!
(نفیرِ شوق، ص۔20)

''یہاں غالب کی زمین اور ترکیبیں ہی نہیں بلکہ طرز و تیور بھی غالبؔ کے سے ہیں۔'' (نفیرِ شوق، ص۔21)

''غالبؔ کی طرزِ ترکیبوں اور توہمات کی تقلید یا تتبع سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مشکلات پر پوری طرح قابو پانے کی مشق ہو جاتی ہے اور حضرت یسیرؔ کو اس روایت سے یہی روشنی ملی۔'' (نفیرِ شوق، ص۔22)

موصوف نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ یسیر نے نہ صرف غالب کی زمینوں میں شعر کہا ہے بلکہ مختلف کلاسیکی شعراء کی زمیں میں شعر کہہ کر اپنا فنی مظاہرہ کیا ہے، اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت یسیرؔ کی طبیعت کی روانی ان مشکلات پر بھی فن کے ایسے گھوڑے دوڑاتی ہے کہ نہ صرف ان کی سنگلاخ زمینوں میں بلکہ ان سخت بحروں میں بھی بحرِ ظلمات سے کم نہیں اپنی قدرتِ شاعری کے پردے اٹھا کر قوتِ شاعری کے پرچم گاڑ دیتی ہے۔'' (نفیرِ شوق، ص۔25)

ڈاکٹر رضی الدین احمد نے جہاں دیگر اساتذہ کی زمینوں میں شعر کہنے کا ذکر کیا ہے وہیں ان اساتذہ کے نام بھی گنوائے ہیں جن میں غالبؔ کے علاوہ مومنؔ، داغؔ، حسرتؔ، شاذؔ اور جگرؔ شامل ہیں۔ مذکورہ شعراء میں آخر کے تین شعراء وہ ہیں جن کے یہاں رومانیت کا تصور گہرا ہے۔ ان کا کلام رومانی عناصر کا نمائندہ کلام ہے۔

ڈاکٹر رضی الدین احمد کی نظریں یسیرؔ کے ڈکشن شعری پر ہی مرکوز رہی ہیں۔ اس لیے انھوں

نے ان کے کلام میں پائی جانے والی گہری رومانیت کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔

جو اشعار حوالے کے طور پر مضمون میں پیش کیے ہیں وہ ڈکشن کے ساتھ رومانی عناصر کے نمائندہ بھی ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین احمد ان اشعار کو پیش کرنے سے پہلے جس بات کا اظہار کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یسیؔر کی رومانی فکر کی شناخت کرنے میں بہت قریب تک رسائی حاصل کی ہے لیکن اس کو رومانی کہنے سے قاصر رہے ہیں۔

لکھتے ہیں:

> ''اس مہک اور محویت کا جو تنوع حضرت یسیؔر کے دیوان میں ملتا ہے وہی ان کے استادانہ فن کارانہ اور فاضلانہ مقام اور مرتبہ کا ایک روشن مینار ہے۔''
>
> (نفیر شوق، پیش لفظ، ص۔28)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید:

ادبی دنیا میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آج آپ کا شمار اردو کے چند بڑے نقادوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی تیس سے زائد تنقیدی کتب شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں اور ادبی حلقوں میں مقبول و معروف ہیں۔ آپ نے شری وینکٹیشورا یونیورسٹی کے شعبہ اردو، عربی اور فارسی میں تیس سال خدمات انجام دیں۔ آج ہر طرف اردو کی خدمت انجام دیتے ان کے شاگرد دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے حضرت یسیؔر کے کلام پر جو مضمون لکھا ہے اس کا عنوان ''یسیؔر اور عصری آگہی'' ہے۔

مضمون کی ابتداء میں ڈاکٹر جاوید صاحب نے یسیؔر کو غزل کے کلاسیکی شاعر بتاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حضرت یسیؔر کرنولی، غزل کے مسلم الثبوت شاعر ہیں۔ اردو غزل کو اس کی تمام کلاسیکی نزاکتوں، نفاستوں، ندرتوں اور نکہتوں کے ساتھ عصرِ حاضر میں جن چند شاعروں نے وزن و وقار کے ساتھ برقرار رکھا ہے ان میں ایک اہم نام یسیؔر

کرنولی کا ہے۔'' (مسودہ یسیؔر اور عصری آگہی، ص۔1)

آگے چل کر یسیؔر کے کلام کی چند اہم خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کو عصرِ حاضر کے رجحانات سے قریب قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''فنِ عروض پر استادانہ دسترس اس کی باریکیوں سے غیر معمولی آگہی اردو شاعری کی روایات کا گہرا اور صحیح شعور، پختگی، ٹھہراؤ اور رچاؤ اور ان کے ساتھ زندگی کی عصری قدروں کا احساس اور پاس و لحاظ........ سب نے یسیؔر کی شاعری کے رنگ کو شوخ اور پختہ اور دیدۂ زیب بنا دیا ہے۔ چناں چہ یسیؔر کی غزل کا رشتہ کلاسیکی قدروں سے مربوط ہوتے ہوئے غزل کے نئے رجحانات سے استوار ہو جاتا ہے۔'' (مسودہ، ص۔1)

موصوف نے یسیؔر کے کلام میں غمِ محبوب کی نیرنگی پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اس غم کے لطیف ہونے کا احساس رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں جن اشعار کو حوالے کے طور پر پیش کیا ہے وہ بھی اپنے اندر بھرپور رومانی کیفیت رکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے:

''یسیؔر غمِ جاناں میں ڈوبے سہی لیکن اپنے ماحول سے بے خبر نہیں۔ نفیرِ شوق میں ایسے اشعار پڑھ کر قارئین کو بلاشبہ تعجب ہوگا۔ ایسے ماحول دوست اشعار جن میں شاعر اور ماحول ایک دوسرے میں گم، من تو شدی اور تو من شدی کی تفسیر بن جاتے ہیں: ؎

ماحول ہے گم مجھ میں کہ ماحول میں گم ہوں
کیا بے خبری، بے خبری، بے خبری ہے

ماحول میں یوں گم ہو جانا بے خبری نہیں، دلیل باخبری اور کمال آگاہی ہے۔''

(مسودہ، ص۔2)

مندرجہ بالا شعر کوڈاکٹر سلیمان صاحب یسیرؔ کی رومانیت کی منہ بولتی تصویر کہا ہے۔ باوجود اس بے خبری کو باخبر قرار دینا رومانی لطافت اور کیف و سرمستی سے ناآشنائی کا بین ثبوت ہے۔ چوں کہ یسیرؔ کی رومانیت ایک حقیقت پسند رومانیت ہے اس میں معاشرے سے نظریں چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے یسیرؔ کے یہاں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں معاشرے کی صورتِ حال کی عکاسی ملتی ہے۔

ایک دو اشعار ذیل میں پیش ہیں جو راقم کے خیال کو سہارا دیتے ہیں:۔

غمِ حیات سے ممکن نہیں مفر کہ مجھے
قرار کنجِ قفس میں، نہ آشیانے میں

....

ادھر صیاد کا کھٹکا ادھر ہے خوف بجلی کا
کہاں کا چین گلشن میں، سکوں کیسا نشیمن میں

....

ایسے اشعار جگرؔ کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ جس طرح جگرؔ کی رومانی حس مرتے دم تک ماند نہ پڑ سکی اسی طرح یسیرؔ کی رومانی فکر میں اور ان کے رومانی رنگ میں آخری وقت تک فرق نہ آیا۔ جگر تقسیمِ ہند کے سانحے کے زمانے میں بھی محبت کے راگ الاپتے رہے۔ یسیرؔ نے بھی یہی کیا۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

غمِ حیات، غمِ آرزو، غمِ منزل
دخیلِ غم ہے، محبت کے تانے بانے میں

....

بنا ہے ان کو شورشِ صبحِ حیاتِ نو
نغمے جو ہیں نہاں شبِ غم کے رُباب میں

....

مندرجہ بالا اشعار میں حالات کا احساس موجود ہے باوجود اس کے رومانی رنگ و روغن میں فرق نہیں آیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید صاحب یسیرؔ کو اپنے عہد کا نباض مانتے ہیں۔ ان کے عہد میں پائی

جانے والی بے چینی شورش ہنگامہ آرائی، اخلاقی قدروں کے زوال وکساد بازاری معاشرتی بحران وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یسیرؔ نے ان ساری باتوں کو اپنے اشاراتی وکنایاتی انداز اور رمزیہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ بات اپنی جگہ صحیح ہوتے ہوئے بھی یسیرؔ کو ان کے اصل رنگِ شعری سے دور لے جاتی ہے۔

ڈاکٹر جاوید صاحب نے یسیرؔ کے جن اشعار پر توجہ دی ہے ان میں سے چند یہ ہیں: ۔

یسیرؔ ان دنوں خیر کی خیر مانگو
کہ شر و فتن پاؤں پھیلا رہے ہیں

....

مآلِ شورشِ ہنگامۂ حیات نہ پوچھ
بس اک سکون کے لیے انتشار سے گذرے

....

ایسے اشعار نفیر شوق سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جا سکتے ہیں لیکن یہ یسیرؔ کا اصل رنگ نہیں۔ یہ ضمنی انداز ہے اس لیے بھی کہ شاعر بھی ماحول اور زمانے کے اثرات سے دور نہیں رہ سکتا۔

یسیرؔ بھی اپنے ماحول اور حالات کا اظہار کرتے ہیں تو اس سے ان کو ان کے اصل رنگ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یسیرؔ کے غمِ محبوب کے ساتھ غمِ دوراں کا پایا جانا کوئی ایسی چونکا دینے والی بات نہیں۔ ہر چھوٹے بڑے شاعر کے کلام میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ملتے ہی ہیں۔ رومانی شاعر اخلاص واخلاق، انسانیت کا غمگسار اور اس درد کا مداوا تلاش کرنے والا ہوتا ہے۔

یسیرؔ کے ایسے ہی اشعار ان کی عصری آگہی کو نمایاں کرتے ہیں: ۔

جب کسی کو بھی چوٹ لگتی ہے
درد سے میں بھی تلملاتا ہوں

....

منزل سے دور راستہ دشوار ہے یسیرؔ
ڈرتا ہوں مجھ پہ شاق نہ گذرے سفر میں دھوپ

....

ڈاکٹر جاوید صاحب یسیرؔ کے غم کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''غم ان کی غزل کا اہم ترین موضوع ہے۔غم جو بے دلی اور فرار کی تعلیم نہیں دیتا زندگی کے لیے ایک نئی قوت کا کام کرتا ہے۔''

یسیرؔ کے غم کی جن خصوصیات تک ڈاکٹر جاوید صاحب نے رسائی حاصل کی ہے وہ پوری طرح رومانوی شاعر کا غم ہے۔اس میں سرشاری بھی ہے اور ہوشیاری بھی جو حقیقت پسند رومانیت کی علامت ہے۔اس نوعیت کے چند اشعار انہوں نے پیش کیا ہے۔

اشکِ غم زخمِ جگر داغِ تمنا کی بہار
پوچھیے ان سے دلِ زمزمہ پر داز کا راز

....

اور بھی ہو گئی بے تاب تمنا دل کی
فائدہ کچھ تو ہوا ضبطِ فغاں کے باعث

....

سنبھل اے دل کہ ذوقِ دید میں پھر اضطراب آیا
تمنا میں تڑپ آئی تقاضوں پر شباب آیا

....

ڈاکٹر عبدالرّزاق فاروقی:

عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغین میں ڈاکٹر محمد عبدالرّزاق فارقی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ایم۔اے، ایم۔ایڈ ہونے کے بعد عبدالقادر سروری صاحب کی زیرِنگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے رجسٹریشن کروایا جب عثمانیہ کالج کرنول میں اردو لکچرر کی حیثیت سے تقررعمل میں آیا تو آپ نے اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا کام شری وینکٹیشورا یونیورسٹی سے ڈاکٹر رضی الدین احمد کی زیرِ نگرانی میں

مکمل کیا۔ آپ شری وینکٹیشورا یونیورسٹی کے شعبہ اردو، عربی اور فارسی کے پہلے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں وہ کرنول میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے حضرت یسیرؔ سے ان کے روابط بڑے گہرے تھے۔ جشنِ یسیرؔ سے پہلے یسیرؔ کی گل پوشی وشال پوشی کے ساتھ اپنے گھر سے اس جشن کا آغاز کیا۔ نفیرِ شوق پر تنقیدی نظر ڈالی۔ ''نفیر شوق کا شاعر'' کے عنوان سے ایک تنقیدی و تاثراتی مضمون تحریر فرمایا جس کی ابتداء میں کرنول کی تاریخ پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی ہے اور اس کی علمی وادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا سلسلہ یسیرؔ سے ملایا ہے اور لکھا ہے:

> ''یسیرؔ کی شخصیت اور ان کا فن ہماری شرافت، نجابت اور ادبی ذوق کا حسین امتزاج ہے...... یسیرؔ کو میں، کرنول میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ یسیرؔ کی شاعری ان کی ساری عمر کی کمائی ہے۔''
>
> (فکرِ نو مجلّہ شعبہ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی، نفیر شوق کا شاعر، ص۔4)

ڈاکٹر فاروقی کو اس بات پر حیرت ہے کہ یسیرؔ نے اپنے زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کی طرز اور فکر سے کیوں استفادہ نہیں کیا جب کہ ان کا زمانہ قریب قریب اقبالؔ، چکبستؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور فانیؔ وغیرہ کا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یسیرؔ نے اس دور کی ادبی روش سے اکتساب کم کیا ہے اور کتب بینی کے سہارے ایک صدی قبل کے لب ولہجہ کو اپنی شاعری کے لیے بطور نمونہ اس دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔'' (مجلّہ گلبرگہ یونیورسٹی، نفیر شوق کا شاعر، ص۔6)

ڈاکٹر فاروقی یسیرؔ کو ''غالبِ دکن'' کہتے تھے تو غالبؔ کو ڈیڑھ صدی پرانا شاعر کہنے میں کوئی غلطی نہیں اور یسیرؔ کے دور میں وہ ایک صدی پرانا شاعر ضرور رہا ہے لیکن یسیرؔ نے اپنے دور کے نہ صرف استاد شعراء کے کلام سے اپنے کلام کو قریب کیا ہے بلکہ وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس دور کی دو اہم تحریکیں رومانی اور ترقی پسند تحریک سے اپنے لیے ایک کو منتخب کیا جو ان کے مزاج اور ماحول سے میل کھاتی تھی یعنی رومانیت اور ساری زندگی اسی طرزِ شعری اور فکرِ شعری میں لگے

رہے اور ڈاکٹر فاروقی کا یہ الزام بھی درست نہیں:

''یسیر کی شاعری ماضی کے ''دورِگل'' سے ذہنی وابستگی کا حسین مرقع ہے انھوں نے اساتذہ کے کلام کے مطالعے کے سہارے اگلے وقتوں کے اظہار کے سانچوں میں خود کو محصور کرلیا ہے۔''

(مجلّہ گلبرگہ یونیورسٹی 1988، نفیر شوق ،ص۔7)

''اگلے وقتوں کے اظہار کے سانچوں میں خود کو محصور کرلیا'' سے مراد فاروقی صاحب کے نزدیک قدیم صنفِ سخن غزل تک ہی یسیر کا محدود ہوتا ہے۔ کسی دوسری صنفِ شاعری پر توجہ کا نہ دینا ہوسکتا ہے لیکن یسیر نے جس محبت کے گیت گائے ہیں وہ غزل ہی میں زیادہ پُر کیف و پُر لطف دکھائی دیتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

محبت نے دکھائے ہیں قرینے عزم و ہمت کے
ارادے کے موافق ہو ہی جاتا ہے جگر پیدا

....

تاکِ اِدراک سے کھینچ آتی ہے تو پی جاتا ہوں
مجھ پہ احسان نہ ساقی کا نہ پیمانے کا

....

یہ کس نے عارضِ تاباں پہ زلف لہرا کر
صباحتوں کو سپرد سوادِ شام کیا

....

تمہاری یاد جو آئی حسین راتوں میں
جگر میں درد نے اٹھ اٹھ کے احترام کیا

....

موصوف کی غزل میں تغزل اور جمالیاتی پہلو کا پایا جانا دراصل اس کی رومانی ہونے کا نتیجہ ہے۔ یسیرؔ کی غزل قدیم اور کلاسیکی غزل نہیں جو لب و رُخسار، چوٹی کنگھی، مانگ مہندی، ناز و ادا اور ایسی ہی بے شمار باتوں کا مرکب ہوتی ہے۔ یسیرؔ کی غزل میں ہجر و وصال، فراق و رقیب کے وہ سائے بھی نہیں جو عشقیہ غزل کا حاصل رہے ہیں۔ یسیرؔ کی غزل وہ محبت کے جذباتی و محسوساتی عمل کا نام ہے جس کی لذت عاشق ہی محسوس کر سکتا ہے۔

یہاں محبت پاک وصاف اور محبوب کا تصور ماورائی ہے۔ وہ جس حسن کا طالب ہے وہ اس کو کائنات کی ہر شئے سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

یسیرؔ کا یہ اشعار دیکھیے:

آئینہ شہود میں ہوتے ہیں عکس ریز
واللہ کس قماش کے آئینہ گر ہیں آپ

....

کس تجلی سے ہوا کرتے ہیں گل میں عکس ریز
جانے کس نے رکھ دیا گلشن کے اندر آئینہ

....

موصوف نے یسیرؔ کی غزل جس کی ردیف ''جواب بھی نہ آئے تو کب آؤ گے تم'' کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہجر اور وصال برابر کارفرما رہیں گے۔ زندگی کے حسین اور اہم لمحات اس کیفیت سے ہمیشہ سرشار رہیں گے۔ یسیرؔ کی مربوط غزل یہاں پیش ہے۔ آپ بھی اس جذبہ کی سرشاری میں کھو جائیں گے۔''
>
> (مجلّہ گلبرگہ یونیورسٹی 1988ء، نفیر شوق کا شاعر، ص۔9)

ڈاکٹر فاروقی یسیر کے جذبات و احساسات کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی شاعری میں رومانیت کا عنصر اس قدر پایا جاتا ہے کہ جنسی کیفیات کبھی کبھی ان کی شاعری کا جز بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ یسیرؔ کی غزل کا لہجہ مردانہ ہے وہ اس کو ان کے پٹھان

ہونے کی وجہ بتاتے ہیں۔

فاروقی کے نزدیک اس کے ساتھ یہ ان کی پیروی غالبؔ کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔ آگے چل کر ڈاکٹر فاروقی لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے غزل کے قدیم رنگ سے پاسداری کے ساتھ ساتھ عمرانی مسائل کے اظہار کی ذمہ داری کو بھی خوب نبھایا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان کسی خاص نظریہ کے پروپگنڈے کی زبان نہیں ہے۔ وہی زبان جس کا روایتوں سے رشتہ استوار ہے۔'' (مجلہ گلبرگہ یونیورسٹی 1988، نفیر شوق کا شاعر، ص۔11)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے یسیرؔ کی زبان کو غزل کے قدیم رنگ کی پاسداری کرنے والی زبان کہا ہے جس کا روایتوں سے رشتہ بندھا ہوا ہے۔ میرے نزدیک یسیرؔ کی زبان اتنی پرانی یا قدامت کی نمائندہ نہیں۔ اس میں قلی قطب شاہ، ولیؔ یا نظیرؔ کی زبان کی طرح قدامت نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چند ایسے الفاظ اشعار میں آئے ہیں جو آج کل مروج نہیں ہیں۔ چند غیر مروجہ الفاظ کے اشعار میں آجانے سے ساری زبان کو قدیم کہہ دینا مناسب نہیں ہے۔

ڈاکٹر فاروقی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ نفیر شوق کے شاعر نے حیات کی تعمیر کے خلوص میں غزل کو بڑی حد تک آبگینہ کی طرح سنبھال کر برتا ہے۔ یسیرؔ کا غزل کے ساتھ اس طرح کا عمل صرف اس لیے ہے کہ وہ ایک رومانی شاعر ہیں اور رومانیت کی پاسداری نے یسیرؔ کو غزل کے پھر سے تازہ کرنے میں مدد ملی ہے۔ اسی طرح کا عمل جگرؔ نے بھی غزل کے ساتھ کیا ہے۔ وہاں جگرؔ کا غزل کے ساتھ خلوص اور غزل کو رومانوی افکار سے نوازنے کا عمل صرف اسی بنیاد پر ہے کہ وہ رومانیت کے علمبردار تھے ورنہ نظم کی شہرت کے زمانے میں غزل کا دامن تھام کر اس کے نئے انداز سے گیسو سنوارنا اور پھر عوام میں اس کو مقبول بنانا یوں ہی نہیں تھا۔

جگرؔ نے رومانوی افکار کو غزل میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان افکار کو ترنم سے بھی مقبول کیا۔ مترنم بحروں کے استعمال سے اس میں دلکشی پیدا کی۔ یسیرؔ تحت میں پڑھتے رہے۔ لوگ یسیر کے شعر سنانے کے اس انداز سے بھی ترنم کا مزہ لیتے تھے۔ مشاعرے میں شریک سامعین رومانی

افکار سے واقف نہ ہوں لیکن افکار کی دل نشینی انھیں جھومنے پر مجبور کرتی تھی، واہ واہ کرنے پر آمادہ کرتی تھی۔

موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یسیرؔ کی ایسی غزلیں جن میں وہ زندگی کی صعوبتوں اور کڑی دھوپ کا ذکر کر کے امید کے سایے کا یقین دلاتے ہیں مترنم نہیں ہیں۔ ان میں مسائلِ حیات کا بوجھ ہے۔'' (مجلہ گلبرگہ یونیورسٹی 1988، نفیر شوق کا شاعر، ص۔13)

موصوف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''نفیرِ شوق'' کے شاعر کو جذبات کے بیان کرنے میں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ڈاکٹر موصوف اس سے بے خبر نہیں کہ رومانی شاعری میں جذبے اور وجدان کو فکر سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ رومانی شاعری ایک سرمدی کیفیت و سرور کے حصول کا مقصد رکھتی ہے اور یسیرؔ کا کلام ان ہی عناصر کا مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر فاروقی یسیرؔ کے رومانی کلام کی تاثیر سے بچ نہیں سکے ہیں اسی لیے لکھتے ہیں

''نفیرِ شوق کے مطالعہ کے وقت بھی میں اکثر شعر پڑھتے پڑھتے رک جاتا ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آرٹ گیلری کے پُرسکون ماحول میں میری آنکھیں تصویر کے رنگوں کے حسین امتزاج سے فنکار کی رُوح تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔''

(مجلہ گلبرگہ یونیورسٹی 1988، نفیر شوق کا شاعر، ص۔14)

شاعری میں یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ وجدان اور جذبے کی بنیادوں پر تخلیق پائے۔ جذبے اور وجدان کی بنیادوں پر تخلیق پانے والے شاہکار رومانی ہی ہوا کرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے قاری وہی بات محسوس کرتا ہے جس کو ڈاکٹر فاروقی نے محسوس کیا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے باوجود ڈاکٹر فاروقی نے نفیر شوق کے شاعر کو ایک رومانی شاعر قرار نہیں دیا اور نفیر شوق کو رومانی غزلوں کا مجموعہ کہنے سے قاصر رہے۔ اس نوعیت کے چند اشعار وہ ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہوں

محبت نے سکھائے ہیں قرینے عزم و ہمت کے
اِرادے کے موافق ہو ہی جاتا ہے جگر پیدا

....

تاکِ اِدراک سے کھینچ آتی ہے پی جاتا ہوں
مجھ پہ احسان نہ ساقی کا نہ پیمانے کا

....

تو دل کی تاب، چشمِ تمنا کا نور ہے
اتنا قریب ہو کہ نگاہوں سے دور ہے

....

کس قدر شفاف ان کے حسن کا ماحول ہے
بن گیا ہے خیر سے منظر کا منظر آئینہ

....

مندرجہ بالا اشعار میں اظہارِ تخلیقیت کے ساتھ ساتھ رومانیت کے پہلو بھی اُجاگر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ:

جنوبی ہند کی ادبی دنیا میں ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے مدراس یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے برسوں خدمات انجام دیں۔ مدراس کے مشاعروں میں جب یسیرؔ شریک ہوتے تھے تو ڈاکٹر نجم الہدیٰ سے بھی ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر موصوف یسیرؔ کی شخصیت و شاعری سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کے اخلاق واطوار کی بھی تعریف کیا کرتے تھے لیکن جب نفیرِ شوق پر اظہار خیال کے لیے ان سے کہا گیا تو موصوف نے ان ہی باتوں کو دہرایا جو یسیرؔ اور ان کے کلام سے متعلق عام ہوگئی تھیں۔

لکھتے ہیں:

''ان کے (یسیؔر کے) دوستوں نے انھیں غالبؔ دکن کا خطاب دیا اور پھر پورے جنوبی ہند میں انھیں غالب دکن کہا جانے لگا۔ ویسے غالبؔ کی زمینیں، حضرت یسیر کو مرقوب نہیں، غالب کی مشکل پسندی بھی مطبوع ہے۔ جناب یسیؔر سنگلاخ زمینوں میں گل بوٹے کھلانے کے عادی ہیں۔ ان کے اس شوق کے پیش نظر ان کے بعض دیگر احباب نے انھیں شاہ نصیر دکن کا خطاب بخشا۔''

(ماہنامہ شاہین کرنول مارچ، ص۔1984)

انہوں نے اس تعلق سے اپنی جانب سے کچھ نہیں کہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے یسیؔر کے کلام پر اظہارِ خیال سے پوری طرح دامن بچالیا ہے۔ یہ ایک طرح سے شاعر کی عظمت کو گھٹانے کی سعی ہے۔

موصوف نے یسیؔر کی شاعری میں رومانیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی شخصیت کا مکمل طور پر جائزہ لیا ہے۔ یسیؔر صاحب کی شاعری کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نجم الہدیٰ نے لکھا ہے کہ موصوف کی شاعری وقت گذاری نہیں بلکہ حقیقی شاعری ہے جو کہ وقتی شاعری سے الگ ہے۔ ان کی فکر اور اندازِ پیش کش سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یسیؔر کرنولی نے ''دماغی قوت'' کا خصوصی طور پر استعمال کیا جو کہ رومانیت کی پہلوؤں کا اہم پہلو ہے جہاں تخلیق کار اپنی دماغی قوت سے اپنی تخلیقات کو معتبر بناتا ہے۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ لکھتے ہیں:

''یسیؔر صاحب کی شاعری صرف دفع الوقتی کا دماغی مشغلہ بن کر نہیں رہ گئی بلکہ وہ اس میں چیزے دیگر بھی ہے جو شاعری کو حقیقی بناتی ہے یعنی جذبے کی وحدت اور فکر کا وہ عنصر جس کے بغیر آج تک کوئی شاعر کامیاب نہ ہوسکا۔''

(نقد یسیؔر از نظام الدین، ص۔70)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یسیؔر کی شعری رومانیت ان کے دماغی پرتوں کو کھول دیتی ہے۔

❧❧

ڈاکٹر اوج یعقوبی:

ڈاکٹر اوج یعقوبی حیدرآباد کے مشہور و معروف شاعر ہیں جن کو حکومت کی جانب سے ''ملک الشعراء'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ حضرت یسیرؔ سے ان کی دوستی انتہائی علمی و ادبی بنیادوں پر قائم تھی۔ حضرت یسیرؔ ان کے مشوروں کو اہمیت دیا کرتے تھے۔ ان ہی کے مشورے پر یسیرؔ نے نفیر شوق پر پیش لفظ لکھوانے پر رضامندی کا اظہار کیا ورنہ وہ بغیر کسی پیش لفظ یا نقاد کی رائے کے اپنے کلام کو شائع کرنا چاہتے تھے۔ اوج یعقوبی نے تعارف میں حضرت یسیرؔ کے کلام اور شخصیت پر مختصر مگر نہایت جامع خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ ایک شاعر ہی ایک شاعر کی اصلیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

اوج یعقوبی لکھتے ہیں:

> ''مختصر یہ کہ شرافت وانکساری، سادگی ومحبت کے اس پیکر کو دیکھ کر پہلے پہل یہ ماننے ہی کو تیار نہ ہوا کہ واقعی یہ صاحب کوئی شاعر ہوں گے لیکن جب اس کے مشاعرہ میں غالبؔ کی ایک سنگلاخ زمین میں یسیرؔ صاحب نے غزل سنائی تو خود میری ہمہ گوئی اور ہمہ دانی کا احساس متزلزل ہو کر رہ گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کرنول جیسے دور افتادہ مقام میں ایسا شاعر بھی ہوگا۔ میں اگر زیادہ صاف گوئی سے کام لوں تو بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہوں کہ رفع شک کے طور پر میں نے ان سے کچھ سنانے کی خواہش کی چناں چہ یسیرؔ صاحب نے غالبؔ ہی کی زمینوں میں مزید دو غزلیں سنائیں نتیجتاً مجھے کہنا پڑا کہ علامہ یسیرؔ کو ''غالبِ دکن'' کا خطاب دیا جانا چاہیے۔'' (نفیر شوق تعارف، اوج یعقوبی، ص۔4)

موصوف نے جہاں یسیرؔ کی دقیقہ رسی اور دقت پسندی کا اعتراف کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ یسیرؔ کے کلام کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد یسیرؔ کے اندر بیٹھے ہوئے شاعر کو ادبا سلام کرنا ہی پڑتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یسیرؔ کے کلام کی جاذبیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یسیرؔ نے خیال کے نئے پیکر بنا لیے اور اپنے لفظوں کا نیا پیرہن تیار کر کے غزل

کو زیب تن کیا۔ بعض اوقات ان کے اشعار کا پیکر افکار کا بدن اور الفاظ کا لبادہ اتنا جاذب نظر اور دیدہ زیب ہوتا ہے کہ ان کے نگارِ غزل کا اغوا کر لینے کو جی چاہتا ہے۔''

(نفیر شوق تعارف، ص۔6)

موصوف کا تنقیدی زاویہ نظر مختلف ہے وہ ہر تحریک اور اس کے عروج و زوال اور افکار کے اثرات کا ذکر اپنے انداز میں کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ یسیرؔ نے اپنی غزل کو اس دور کے غزل گو شعراء کے اندازِ غزل گوئی سے مختلف رکھا ہے اور ان کے نگارِ غزل کے اغوا کا ذکر کر کے اس رومانی غزل کی تاثیر سے متاثر ہونے کو نہایت واضح انداز میں بیان کر دیا ہے۔
''یسیرؔ کے ناقدین'' میں کسی نے بھی یسیر کی رومانی شاعری اور ان کی رومانیت کی طرف توجہ نہیں کی۔ راقم السطور نے اس لحاظ سے پہلی مرتبہ یسیرؔ کے کلام کو رومانیت کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے۔ خود یسیرؔ نے بھی اپنے کو رومانی شاعر اور اپنے کلام کو رومانیت کا نمائندہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔
اس طرح راقم نے یسیرؔ اور کلامِ یسیرؔ کے تعلق سے ایک ایسی ذمہ داری کو پورا کرنے کی سعی کی ہے، جس کے بغیر یسیرؔ اور کلامِ یسیرؔ سے پوری طرح آگہی ممکن نہ تھی۔
یسیرؔ کرنولی کی شاعری ان کے مزاج اور شخصیت سے میل کھاتی ہے۔ اس بات کا اعتراف حضرت اوج یعقوبی نے اپنے انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یسیرؔ کرنولی کا مزاج ان کی خود اعتمادی سے متصل ہے۔ اس لیے ان کی شاعری روایت کی انحراف ہے جب کہ خود اعتمادی رومانیت کا ایک اہم عنصر ہے جو خودداری اور خود پسندی کے پہلوؤں سے مل کر بنتا ہے۔

اوج یعقوبی اپنے ایک مضمون ''تعارف'' میں لکھتے ہیں:

''یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ شاعر کے کردار کا عکس عموماً اس کے شعر میں رقص فرما ہوتا ہے۔ چناں چہ علامہ یسیرؔ کے کلام کی شستگی و شائستگی علامہ یسیرؔ کے دور کی خاص روایات میں شامل تھی لیکن یسیرؔ کی خود اعتمادی نے اس روایت سے کامیاب انحراف کیا۔ چناں چہ فن شاعری میں یہ کسی کے دست گرفتہ نہیں ہیں۔

ان کی نظر ہی ان کی رہنما اور ان کا مزاج ہی ان کا مصلح بنا رہا۔''

(نقد یسیر از ڈاکٹر نظام الدین، ص۔49)

مندرجہ بالا اقتباس یسیر کی شاعری کی خصوصیت رومانیت کا حامل ہے۔ اس وجہ سے ان کی شاعری میں خود اعتمادی کا جذبہ فراواں ہے۔

ڈاکٹر وحید پاشاہ قادری کوثر:

ڈاکٹر وحید پاشاہ قادری نے یسیر کرنولی کی شاعری پر اپنا تنقیدی نظریہ مختلف پہلوں سے ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے یسیر کرنولی کے کلام کا نہ صرف خارجی و باطنی احساسات کا جائزہ لیا ہے بلکہ ان کی شخصیت کی عکاس ان کی تخلیق کردہ شاعری میں ڈھونڈ کر صفحہ قرطاس پر ڈھالنے کی سعی کی ہے۔ وہ اپنے زاویہ نظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ''یسیر ایک رومانی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں خیال کی رنگینی کو ملحوظ رکھا ہے اور جہاں تک ہو سکے عمدہ اور اعلیٰ پیرائے بیان میں خیال کو ادا کرنے کی سعی کی ہے۔'' وحید کوثر کے اس نظریہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ یسیر کرنولی کی شاعری کا داخلی جائزہ لیتے ہوئے اپنے علمی ونفسیاتی تنقید کا مظاہرہ کیا ہے۔ یوں تو وحید کوثر کا علمی ونفسیاتی تنقیدی دبستان سے خاص رشتہ رہا ہے۔ وحید کوثر نے یسیر کرنولی کی شاعری میں رومانیت بھرے اشعار کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جنونِ عشق نے آگے بڑھایا
خرد کی منزلوں سے ماورا ہوں میں

جذبۂ عشق کے اک تاثر کو یسیر
نقش برعالم ایجاد کروں یا نہ کروں

مرا سوز ، مری دولت، مرا غم ، مرا خزانہ
مجھے عشق نے دیا ہے یہ مقامِ خسروانہ

رومانیت کو عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس رجحان کی بنیادی خصوصیات تخلیق کی آزادی، آمد، آہنگ، خلوص، خیال کی آزادی، ایہام پرستی، قسمت اور خدا سے بغاوت، معنی خیزی، علامت نگاری اور پیکر تراشی وغیرہ ہیں لیکن وہ خصوصیت جسے اس تحریک کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے وہ اس کی داخلیت یا جذبہ و وجدان کی ترجمانی ہے۔ کلاسیکی شعراء ایک منظم سوسائٹی سے اپنا رابط و تعلق رکھتے ہیں جب کہ رومانی شعراء تمام خارجی قوانین سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیا آپ بنالیتے ہیں ان کے نزدیک سچی آزادی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی اپنی من پسند دنیا میں جی سکے۔ سماجی بندشیں، تہذیبی تصنع اور اخلاقی ضابطوں سے بھی رومانی شعراء منحرف ہوتے ہیں۔ انہیں حوالوں سے یسیر کرنولی کی من پسندانہ مزاج کو ان کی شاعری کا غماز بناتے ہوئے وحید کوثر نے اپنے تاثراتی تنقید کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''رومانی ادیب و شعرا معاشرے میں ہونے والے جبر و استبداد اور ظلم و استحصال کے خلاف بھی آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ اس لئے رومانیت کو انفعالی خیال کرنا زیادہ صحیح نہیں۔ بعض صورتوں میں یہ فعال بھی ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک داخلی قوت ہے، جس سے احساس کا نشات ثانیہ ممکن ہے۔ اس میں مذہبی و معاشرتی بندشوں سے آزاد رہنے، فرد کی انا کا تحفظ کرنے اور معاشرے کی استبدادی قوتوں سے بغاوت کا عنصر بھی شامل ہے۔ اس میں تصوریت اور ماورایت کے ساتھ جذباتی انتہا پسندی بھی ملتی ہے۔ یسیر کا کلام پوری طرح ان عناصر کو پیش کرتا ہے۔ یسیر کے مزاج میں انا اور خودداری کا جو شعور تھا اس نے ان کی رومانی فکر میں خوب خوب رنگ بھرا ہے۔''

ڈاکٹر وحید کوثر کا تنقیدی شعور، ان کا نظریہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ موصوف نے یسیر کرنولی کی زندگی کے حالات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کے ساتھ جو وقت گزار کر ان کی نفسیات کو پرکھنے اور ان کے کلام میں جو رومانی تحریک کا عنصر پایا جاتا ہے اس کو منظر عام پر لانے میں انہوں نے بدرجہ اتم محنت کی ہے۔

ڈاکٹر یعقوب شریف:

ڈاکٹر یعقوب شریف کا مقالہ بعنوان ''غالبِ دکن یسیر کرنولی حیات اور شاعری'' سنہ 2019ء کو منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کتاب کے تحت موصوف نے یسیر کرنولی کی حیات اور شاعری کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔ موصوف نے اپنے مقالے میں کئی ایسے مواقع اور سطور پیش کیے ہیں جس

میں یسیرؔ کرنولی کی شخصیت میں رومانیت کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں مگر موصوف نے کہیں بھی لفظ رومانیت استعمال نہیں کیا ہے پر رومانیت کے عناصر کو موضوعی شکل میں مختلف زاویہ نظر سے پیش کرنے کی سعی کی ہے ان کے مجموعے کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف نے مختلف حوالوں سے رومانیت کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ان میں داخلی جذباتیت اور انفرادیت، تصورحسن وعشق، حسن پرستی، جذبہ محبوبیت جیسے عناوین قابل ذکر ہیں۔

موصوف نے یسیرؔ کرنولی کی داخلی جذبوں کے حوالوں سے ان کی زندگی کے کئی واقعات پیش کیے ہیں۔ان میں مندرجہ ذیل سطور اس کے ضامن ہیں۔

لکھتے ہیں

> ''غالب کی استغنا، اَنانیت، بلند خیالی یہ سب چیزیں یسیرؔ کی طبیعت میں بھی پائی جاتی ہیں۔یسیر اتنے خوددار ہیں کہ وہ کسی اجنبی سے بغیر تعارف کے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔جس طرح غالب کو اپنے فن پر ناز تھا اسی طرح یسیر کو بھی اپنے فن پر ناز ہے۔''

(غالبِ دکن یسیر کرنولی: حیات اور شاعری از ڈاکٹر یعقوب شریف، ص۔171)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یسیرؔ کرنولی کی طبیعت ومزاج غالب سے متصل ہے۔اسی نسبت سے یسیرؔ کرنولی کو'' غالبِ دکن'' کہا گیا ہے۔مزید تخلیقیت میں بھی یسیرؔ کرنولی نے غالب کی تقلید کی اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی شاعری اور مزاج میں رومانیت کو اپنانے کی سعی کی۔

اس حوالے سے چند اشعار ڈاکٹر یعقوب شریف نے منتخب کیے ہیں:۔

نہیں ہوتا ہے سوالِ شوخیِ برق و شرر پیدا کر
اے ذوقِ نظر پہلے وہ بات تو پیدا کر

....

اے برق! کیوں مرا ہی تجھے آشیاں ملے
ملنے کی طرح ہم سے وہ اب تک کہاں ملے

....

یہ شکستہ چیز ہی کیا میرے جنوں کے آگے
میرے جذبۂ وفا نے مجھے دی خود اعتمادی

....

جہاں میں ایک کو ہے دوسرے پہ فوق یسیؔر
کرے نہ اس لیے فنکار اپنے فن کا گھمنڈ

....

ڈاکٹر یعقوب شریف لکھتے ہیں کہ یسیؔر کرنولی نے تو دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اس میں سب سے پہلے یہ کہ وہ اپنی تخلیقات سے شہرت پانا نہیں چاہتے تھے ان کے نزدیک شہرت ایک عذاب تھی دوسری یہ کہ نوجوانی میں وہ اپنے پیار و محبت میں نا کامیاب ہوئے پھر کسی برہمن سے پیار کر بیٹھے اس میں بھی ناکامیابی ہاتھ آئی اور اپنا کلام بارش میں بہہ جانے کی وجہ سے مایوس ہو کر تخلیقیت سے بارہ سال دور رہے۔

ڈاکٹر یعقوب شریف ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

> ''یسیر نے 1926ء سے شعر کہنا شروع کیا تھا لیکن ایک مرتبہ اپنا کلام بارش کی زد میں آ کر اچانک تلف ہو جانے کی وجہ سے انھوں نے لگ بھگ ۱۲ سال تک شعر و شاعری سے منہ موڑ لیا اور شاعری سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ ان ہی دنوں یسیر نے پیشۂ وکالت کو بھی اپنی طبیعت کے ناموافق پا کر مسترد کر دیا تھا۔''
>
> (کتاب مذکور، ص۔69)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات تصدیق کی جاتی ہے کہ یسیؔر کرنولی نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی۔ مزید یعقوب شریف نے لکھا ہے کہ یسیر نے اپنے کلام میں عشق کی بستی میں خدا پر مر مٹنے کی کیفیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لیے اپنی شاعری میں زاہد اور رند کا تذکرہ کیا ہے۔ زاہد کا تصور روحانی اور رند اپنے نفسانی نشہ میں چور رہتا ہے۔

اس نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آئینہ حال پہ دل اپنے حال پر
حیراں ہیں دونوں وجہ تحیر الگ الگ

....

زاہد شراب تاب تو تاکِ نظر سے رند
پیتے ہیں دونوں مئے کا تصور الگ الگ

....

منکر نہیں ہوں وحدتِ غم کا مگر یسیرؔ
ہوتا ہے دل پر اس کا تاثر الگ الگ

یسیر کی نظر میں حسن تو ساری کائنات میں موجود ہے۔ ان کو ہر شئے میں حسن کا پہلو نظر آتا ہے۔ یسیر خود حسن شناس اور حسن پرست ہیں اس نوعیت کے چند اشعار موصوف نے نقل کیے ہیں، ملاحظہ ہوں

خورشیدِ زر نگار سے اتنا تو پوچھیے
نکھرا ہے کس کے حسن کے پرتو سے روئے صبح

....

اِک دعوتِ نظر ہے پرستارِ حسن کو
مستی میں کھیلتی ہے شعاؤں سے جوئے صبح

....

وہی حسن ہے میرے مدِنظر
ستاروں میں جس کا جواب آگیا

....

نہ پوچھو حسن میں کیا دیکھتا ہوں
غمِ دل کا مداوا دیکھتا ہوں

....

ڈاکٹر یعقوب شریف کا کہنا ہے کہ یسیرؔ کرنولی حسن و جمال کو اپنے محبوب میں ہی نہیں ڈھونڈتے بلکہ چمن زاروں میں، نسیم سحر میں اور دنیا کی ہر چیز میں تلاش کرتے ہیں۔ ''جذبہ

محبوبیت'' ان کی شاعری کا اہم جز ہے۔ یسیؔر کرنولی کے مختلف اشعار میں جذبہ محبوبیت کے عناصر پائے جاتے ہیں جو رومانیت کا اہم جز قرار دیا جاتا ہے۔

یعقوب شریف نے چند اشعار اس نوعیت کے نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

کلی کلی چمن آرزو کی کھل جائے
نسیمِ شوق! کچھ ایسا خرام کر کے پلٹ

....

ان حجابوں سے چھلکتا رہا حسن
جن حجابوں میں پنہاں ترا رُخ

....

مندرجہ بالا اشعار اور تشریحات کے حوالے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر یعقوب شریف نے یسیؔر کرنولی کی شاعری میں رومانیت کو مختلف انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

꧁꧂

AKS-E-GHALIB

Kalam-e-Yaseer Mein Rumaniyat

by

Dr. Mohiba Vantmuri

"..........رومانی ادب میں تمام تر زور احساس، وجدان اور جذبے پر ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کو مرکز اور رومانی ادب کو مرکز گریز سمجھنا چاہیے۔ کسی نقاد نے رومانیت کو تحیر کی نشاۃ ثانیہ کہا ہے میرا خیال ہے کہ رومانی تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ احساس کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ بنی۔"

(علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر، ص۔125)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

ISBN 978-81-960450-5-0
978-81-960450-5-0
www.ephbooks.com